مشعل

رب زدنی علما

GOVT. DEGREE COLLEGE LATIFABAD HYD.

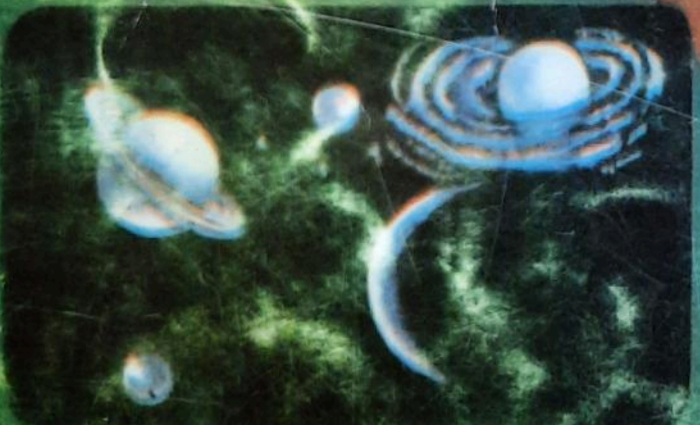

گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد حیدرآباد

اعجاز احمد زاہد بی ایس سی سال اوّل

محمد طارق غوث
فرسٹ ائیر میڈیکس

ہستئ بے ثبات کو رنگ دیا ثبات کا
آپ نے رُخ بدل دیا زاویۂ حیات کا

شرفؔ سیمابی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گورنمنٹ ڈگری کالج، لطیف آباد کا تیسرا مجلّہ

مشعل

سرپرست و پرنسپل:
پروفیسر محمد ذاکر حسین قریشی

مدیر اعلیٰ:
پروفیسر ایم۔ اے منصورؔ

مدیر حصّہ سندھی
پروفیسر حسن علی بگھیو

مدیر حصّہ اردو:
پروفیسر سید عابد حسین

زیر اہتمام

گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد

حیدرآباد سندھ پاکستان

اردو سیکشن

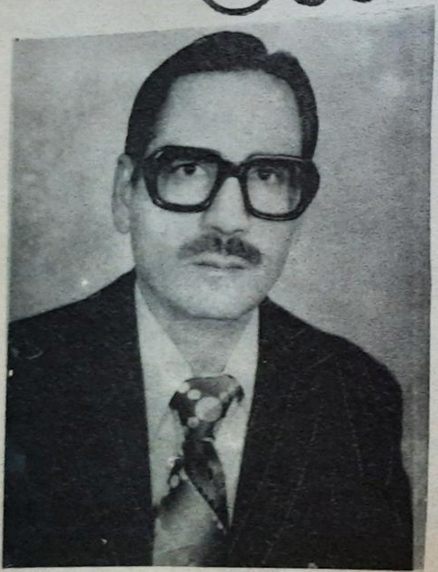

سید عابد حسین عابد
صدر شعبۂ اردو

حسنِ ترتیب

محراب و منبر	اداریہ	سید عابد حسین عابد	
	حمد	حبیب ارشد	۱۱
	حمد	شہزادہ معین خان مظہر	۱۲
	نعت	شہزادہ معین خان مظہر	۱۳
	نعت	محمد فخر عالم	۱۴
چمن زارِ غزل	پروفیسر مسکین احمد منصور ۔ پروفیسر عابد حسین عابد ۔ خالد رضا عارف مجید عارف ۔ لیاقت مسیح ۔ سید سہیل احمد ہاشمی محمد اسماعیل غوری، محمد رضی، محمد الیاس شیخ، ہاشم معز الدین ہاشمی محمد اشفاق عاصم ۔ عتیق جیلانی ۔		۱۷ تا ۲۸
گلستانِ نظم	کل اور آج	چودھری اعجاز احمد اعجاز	۳۳
	نیا سال	محمد حامد عزیز شیخ	۳۳
	احساس	شہزادہ معین خان مظہر	۳۴
	ہجوم ہائے نقشِ پا	محمد اشفاق عاصم	۳۴
	صحابی کی مصیبت	رضوان احمد	۳۵
	انداز تیرا میرا	حارث علوی	۳۵
افسانے	کہانی	محجوب عالم	۳۶
	عید کا دن	حسین عابد	۳۸
	نیا راستہ	شہزادہ معین خان مظہر	۴۱
	ایک مصنف تین افسانے		
	سچے رشتے	عارف مجید عارف	۴۳
	نفی	عارف مجید عارف	۴۶
	وہ ایک لمحہ	عارف مجید عارف	۴۸
انشائیے اور رپورتاژ	جوتا	پروفیسر محمد حفیظ قریشی	۵۴
	محاورے میری زبان میں	طاہر انور بھٹہ	۵۸
	کالج اور ہم	سید محمد عارف	۶۰
ڈرامے	ہم ایک طالب علم	محمد الیاس مغل	۶۲
	ایک یادگار میچ	محمد ندیم جمیل	۶۴
	پرستار غالب	علی حیدر عدنانی	۷۰
	چور اور چوکیدار	وسیم احمد	۷۶
ذکرِ حبیبؐ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا علمی پہلو	ارشد عظیم	۸۲
	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل و انصاف	عبدالاحد عباسی	۸۵
فکرِ سلیم	علوم ریاضی اور مسلمان	پروفیسر ایاز الدین	۹۰
	اسلامی معاشرہ	سید وسیم الحسن	۹۲
	جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی	معراج حسین صدیقی	۹۵
نذر اقبال	اقبال کی شاعری اور اسلامیان ہند	محمد عارف رندھاوا	۹۸
	اقبال اور مرد مومن	مسعود علی خان	۱۰۰
ہم اور ہماری داستان	نظریۂ پاکستان	محمد عظیم گل	۱۰۲
	تحریک پاکستان میں طلبہ کا کردار	محمد اشفاق عاصم	۱۰۴
تاریخ سندھ	قدیم سندھ کا مختصر تاریخی جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر سرفراز مجمی / ترجمہ سید شمس الحق	۱۰۸
ذوقِ تربیت	تعلیمی اداروں میں فوجی تربیت کی اہمیت	انوار الحق	۱۱۳
کھیلوں کے میدان میں	کھیلوں کی سرگرمیاں		۱۱۶

مصور و خطاط

پروفیسر نظر احمد قاسمی ۔
اردو انگریزی ٹائیٹل ۔ اردو سیکشن اور تمام ذیلی سیکشن کی مصوری اور خطاطی ۔ صفحہ نمبر ۹ پر عربی طغرٰی
سندھی سیکشن سندھی طغرٰی
محمد طارق غوث
صفحات نمبر ۲ ۔ ۳۷ ۔ ۵۹ ۔ ۱۱۵

مظہر احمد
اردو انگریزی کے ٹائیٹل بیک اور صفحات نمبر ۱۰ ۔ ۱۶ ۔ ۳۲ ۔ ۹۶
اعجاز احمد زاہد
صفحات نمبر ۱ اور ۸۸

مطبوعہ اتحاد پرنٹنگ پریس، لطیف آباد ۔ ۷ فون ۸۳۴۱۵

محراب و منبر

اداریہ

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے۔

تعلیم کا مقصد طلباء کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اُن کے فکر و نظر میں وسعت پیدا کرنا اور انہیں اپنے معاشرے کے مفید اور کار آمد شہری بنانا ہے۔ اور اسلامی نظریاتی مملکت میں تو تعلیم پر ایک اور ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے کہ وہ مذکورہ مقاصد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طلباء کو اچھا مسلمان بنانے کی بھی سعیٔ کرے۔ یہ مقاصد صرف تکمیلِ نصاب سے پورے نہیں ہوتے بلکہ طلباء کی ہمہ گیر شخصیت کی تعمیر کے لئے غیر نصابی سرگرمیاں بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنی کہ نصابی تعلیم۔ اس لئے ہر درس گاہ اپنی سطح پر غیر نصابی سرگرمیوں کا مقدور بھر اہتمام کرتی ہے۔ جس میں ادبی ورکشاپ، مقابلۂ معلومات، حسنِ قرأت، مضمون نگاری، نعت خوانی، تقاریر، مشاعرے، ادبی عدالتیں مختلف اہم مواقع پر دینی اور قومی جلسوں کا اہتمام اور گیمز اور اسپورٹس وغیرہ کا انعقاد شامل ہیں۔

کسی بھی درس گاہ کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا اجمالی جائزہ اس درسگاہ کے میگزین میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ہر درس گاہ اپنے محدود وسائل اور گوناگوں مسائل کے باوجود میگزین کے اجراء کا اہتمام کرتی ہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد کی چودہ سالہ تاریخ میں یہ تیسرا ادبی مجلّہ ہے۔ اس میگزین کے لئے وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن کامیابی اب نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے مجلسِ ادارت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان طلباء کی کاوشوں کو بھی اس میگزین میں جگہ دی جائے جو ایک دو سال قبل اس درس گاہ سے کامیاب ہو کر رخصت ہو چکے ہیں جبکہ میگزین کا بڑا حصہ ہمارے موجودہ طلباء کی نگارشات پر مشتمل ہے۔ اس میگزین کے سلسلے میں دوسری گذارش یہ کرنی ہے کہ ممکن ہے اہلِ علم حضرات کو اس میگزین کی نگارشات بہت زیادہ معیاری معلوم نہ ہوں، طلباء کی تحریروں سے اس سے بڑھ کر توقع بھی نہیں کی جانی چاہیئے کیوں کہ یہ وہ نومشق اہلِ قلم ہیں جو میگزین کے حوالے ہی سے قلم اٹھاتے ہیں۔ اس میگزین کے زیادہ تر مضامین کالج میں مقابلے کرا کر حاصل کیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ نظم یا غزل کے لئے بھی مقابلے کرائے گئے ہیں البتہ جہاں محسوس ہوا وہاں طلباء کی ضروری رہنمائی کی گئی ہے۔ اس لئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میگزین پر ہمارے ہی طلبہ کی چھاپ ہے۔

عام طور پر میگزین کے اجراء کے لئے سرپرستِ اعلیٰ کا شکریہ ادا کرنا ایک رسم بن گیا ہے۔ لیکن ہم صمیمِ قلب اور پورے خلوص کے ساتھ اپنے سابق پرنسپل محترم جناب پروفیسر ناصر رضا خان صاحب کے انتہائی ممنون و مشکور ہیں کہ ان کی مدد، دلچسپی اور راہ نمائی ہمیں ہر سطح پر حاصل رہی ہے۔ یہ پودا اُن ہی کا لگایا ہوا ہے جو آج پھل لایا ہے۔ ہم اپنے موجودہ پرنسپل محترم جناب پروفیسر ذاکر حسین قریشی صاحب کے بھی سراپا سپاس ہیں کہ انہوں نے کالج میگزین کو ایک باقاعدہ لائحہ عمل دے کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور ان کے مفید مشوروں کی بدولت میگزین کی تزئین زیبائش میں اضافہ ہوا۔

مدیر اردو سیکشن

مظہر احمد　　فرسٹ ایئر آرٹس

حمد

سُر کلیان

حبیب ارشد
اُستاد، شعبۂ اردو، غزالی کالج لطیف آباد

(١)

ارشد طرزِ لطیفؒ میں چھیڑ تو سُر کلیان
حمد ہو تا کہ بیان، اُس کی جو معبود ہے

(٢)

اوّل آخر قدیم ، اللہ ربُّ العالمین
لاثانی اور لاشریک، ارفع اعلیٰ عظیم
لم یولد اور لم یلد ، دانا بینا حکیم
ہے وہ دھیانوں کا خبیر، امکانوں کا علیم
خالقِ، رزاق، کارساز ہے رحمٰن و رحیم
داتا پالنہار وہ ، سچا سائیں کریم
اُس کا لطف عمیم، اپنی کُل مخلوق پر

(٣)

سورج گرمی ، روشنی دن چاند ستارے رات
پتّے پودے پھول ثمر، شاخ ، شجر باغات
ایک سے اِک سوغات کس کس کا ہم شکر کریں

حمد

کوئی ہے جو کہے وہ نہیں ہے؟
قلبِ مومن میں وہ بالیقیں ہے!
تیری شہ رگ سے بھی جو قریں ہے!
اس کو تُو کہہ رہا ہے نہیں ہے
خود سے ہو کر جُدا جانے والے
جستجو جس کی ہے وہ یہیں ہے
ڈھونڈتا ہے تو کون و مکاں میں
اور وہ تیرے دل میں مکیں ہے
شش جہت میں وہی وہ ہے مظہرؔ
ہر نفس جو ترا ہم نشیں ہے

شہزادہ معین خان مظہر
انٹر بائیلوجی

نعت

شہزادہ معین خان مظہر
انٹر بائیلوجی

ہونٹوں پہ دمِ آخر بس نام نبی کا ہو
اور چشم تصوّر میں اُس روضے کا نقشا ہو

دنیا میں تو دل اپنا اب اور نہیں لگتا
حضرت مجھے طیبہ میں بلوالیں تو اچھا ہو

توصیفِ محمدؐ ہو ہر شام سحر یا رب
بیمار کی حسرت ہے ہر دم یہی چرچا ہو

دیوانہ نہیں ہوں میں زائر ہوں مدینہ کا
اے حاجیو امت چھیڑو بتلادو جو رستہ ہو

میں نعت لکھوں مظہرؔ روضے پہ پڑھوں جا کر
اے کاش میرے دل کی پوری یہ تمنا ہو

نعت

محمد فخرِ عالم
انٹر بائیولوجی

ہر اک کارواں کے ہیں رہبر محمدؐ
بناتے ہیں سب کا مقدر محمدؐ

ہے دونوں جگہ اُن کے جلووں کی بارش
زمیں پر محمدؐ، فلک پر محمدؐ

صراطِ محبت پہ چلتے رہیں گے
مقدر سے اپنے ہیں رہبر محمدؐ

فرشتے بھی کرتے ہیں تعظیم ان کی
نظر جن کو آتے ہیں اکثر محمدؐ

رہے جس میں خوفِ خدا فخرِ عالم
اسی دل میں رہتے ہیں آکر محمدؐ

پروفیسر مسکین احمد منصور
صدر شعبہ انگریزی

جو آشوب غم کا نہیں حوصلہ تو، نہ چھیڑو، میں اپنی کہانی کہو تو
میں دل کے سمندر میں اپنے چھپا لوں، یہ اشکوں کی ساری روانی کہو تو

یہ الفت کے نغمے، یہ رنگین سپنے، یہ دنیا میں جینے کے ارماں لینے
مجھے حاصلِ زندگانی ہیں، لیکن، جو تم حاصلِ زندگانی کہو تو

مجھے وقتِ رخصت گلے سے لگا کر، محبت کا اقرار کرتو رہے ہو
بغاوت کی ہمت بھی تم کر سکو گے، اگر ساری دنیا نہ مانی کہو تو؟

وہ اک ساتھ رہنا، وہ ہنسنا ہنسانا، وہ اپنی محبت کا رنگیں زمانہ
کہیں مجھ سے پہلے ہی تم رو نہ دینا، نہ چھیڑوں یہ باتیں پرانی کہو تو

یہ روشن ستارے، یہ ندیوں کے دھارے، یہ پھولوں کے جلوے، چمن کے نظارے
تمہارے تبسم پہ کر دوں نچھاور، یہ سرمایۂ زندگانی کہو تو

مجھے اپنے دل سے بھلا دینے والو، محبت کی مجھ کو سزا دینے والو!
یہ ہنستے ستارے، یہ ٹھنڈی ہوائیں، بھلا دوں یہ راتیں سہانی کہو تو!

وہ ہو ہیر رانجھا کہ یوسف زلیخا، تمہیں یاد تو ہوں گی منصور صاحب
بھلا ہم بھی جانیں کہ ہو قصہ گو تم، یہ سب داستانیں زبانی کہو تو!

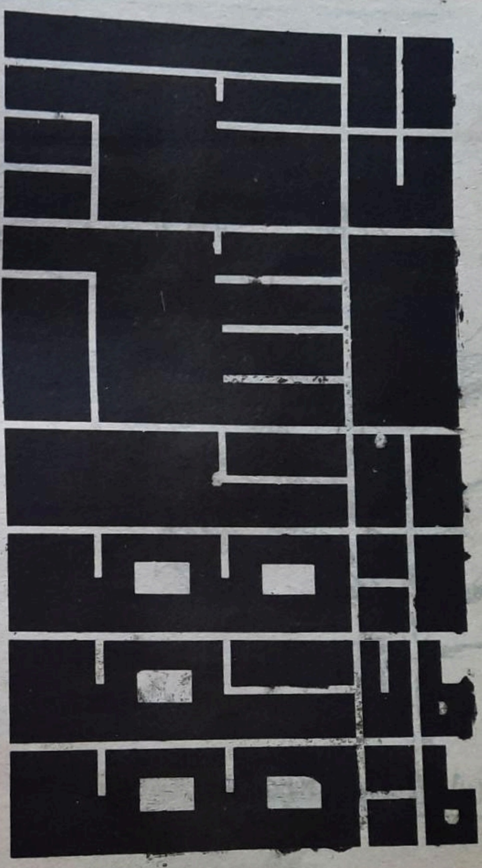

فرسٹ ائیر آرٹس
منظور احمد
قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا - ٹھیک بات کہو !!

پروفیسر عابد حسین عابد
صدر شعبہ اُردو

جب پہاڑوں سے کٹ گیا دریا
ندی نالوں میں بٹ گیا دریا

کیوں نہ پہنچا ہمارے دامن تک
راہ سے کیوں پلٹ گیا دریا

جب روانی رہی نہ موجوں میں
سوکھے پتوں سے پٹ گیا دریا!

تاکہ ہوں بستیاں نئی آباد
اپنے رستے سے ہٹ گیا دریا

خوف سے ضربتِ کلیمی کے
دونوں جانب سمٹ گیا دریا

پکّے رستوں میں جب اماں نہ ملی
کچّے رستوں میں ڈٹ گیا دریا

جب کنارے بھی کٹ گئے عابد
بستیوں کو الٹ گیا دریا

خالد رضا
بی ایس سی، سال اوّل

لب سے ہوتی نہیں ادا سائیں
دل کی ہوتی ہے جو دُعا سائیں

ابر پاروں میں اُس کی یاد کا چاند
رات بھر تیرتا پھرا سائیں

وہ رہا یا پھر اُس کی یاد رہی
میں اکیلا نہیں رہا سائیں

دل پہ جو بھی گذر گئی لیکن
اُس سے کچھ بھی نہیں کہا سائیں

دُو سُنا کر جو خوش ہوا کوئی
کیا ہمارا بگڑ گیا سائیں

کیا نصابوں سے فائدہ ہوتا
کب کتابوں سے کچھ پڑھا سائیں

شاہ و سرمست کو پڑھا سب نے
کوئی خالد نہیں بنا سائیں

فرسٹ ایئر میتھس

آج کے دور میں احساس نگر میں رہنا
اس سے بہتر ہے کسی راہ گذر میں رہنا

بڑھ کے خود شب کی سیاہی سے ملاتے ہیں نظر
ہم نے سیکھا نہیں اُمیدِ سحر میں رہنا

عمر بھر پھر کوئی منزل نہ ہمیں راس آئی
ہائے کچھ دن وہ ترے ساتھ سفر میں رہنا

ہم میں کچھ وصف کوئی بات تو ہو گی صاحب
ورنہ ممکن ہی نہ تھا اُس کی نظر میں رہنا

غم مرا تجھ کو رلائے گا کہ آتا ہے اسے
موم بن کر کسی پتھر کے جگر میں رہنا

فرسٹ ایئر میتھس

یہ الگ اک داستاں ہے حسنِ سادہ کی قسم
اُس کے وعدوں نے جو توڑے ہیں مَرے دل پر ستم

داستانِ عشق کی تکمیل میں مت پوچھیئے
اِک کتابِ دل پہ کتنے زخم ہوتے ہیں رقم

تیری یادوں کی پناہوں میں جب آ جاتا ہوں میں
بھول جاتا ہوں زمانے بھر کے سب رنج و الم

خود بخود دل تیری جانب کھنچنے لگتا ہے مرا
آپ ہی آپ اُٹھنے لگتے ہیں تیری جانب قدم

میرے ہونٹوں پر ہیں عارفؔ شعر کی لہریں تو کیا
دل کے دریا میں لیے پھرتا ہوں اِک طوفانِ غم

لیاقت مسیح
فرسٹ ائیر میتھس

جو نسیم شب کی دعا میں ہے تو اثر کی طرح
تو دھوپ میں ہے کسی سایۂ شجر کی طرح
تمہاری یاد کے موتی صدف کے سینے میں
چھپائے پھرتے ہیں ہم سیپ میں گہر کی طرح
اداس ساری فضا ہے جو تیرے بن ہمدم
اجاڑ ہے مرا دل آج میرے گھر کی طرح
وفا سے باز نہ آؤں تو کیا کروں آخر
کہاں ہے سخت مرا دل ترے جگر کی طرح
مسیح دین سکھاتا نہیں دل آزاری
پیام عام کر اس کا کسی خبر کی طرح

سید سہیل احمد ہاشمی
انٹر بائیلوجی

جس کو عہد شباب کہتے ہیں
اس زمانے کو خواب کہتے ہیں
کتنی آبادیاں ہیں اس دل سے
جس کو خانہ خراب کہتے ہیں
اہلِ دل حسن کی متانت کو
احتراماً حجاب کہتے ہیں
شرم سے سرخ ہوتے عارض کو
ہم سخنور گلاب کہتے ہیں
وقت بدلے تو اے سہیل احمد
سب اسے انقلاب کہتے ہیں

محمد اسماعیل غوری
انٹر بائیلوجی

مجھ کو دنیا نے کیا کیا ستایا نہیں
نام تیرا مگر لب پہ آیا نہیں
زخمِ الفت کو تیری عطا جان کر
دل میں رکھا کسی کو دکھایا نہیں
میں نے سارے جہاں کو بھلایا مگر
تیری یادوں کو دل سے بھلایا نہیں
کتنے طوفان آنکھوں میں امڈے مگر
اشک کا اک قطرہ بہایا نہیں
مجھ سے دنیا نہ تھی دور غوری مگر
اس کو میں نے کبھی منہ لگایا نہیں

محمد یحییٰ
انٹر میتھس

بیدار ہے ادراک اگر تو فرقِ نور و نار کر
جس راہ میں ہو روشنی وہ راہ اختیار کر
سُن اضطرابِ آرزو آئے نہ لب پر گفتگو
ملحوظ رکھ حدِ ادب کچھ اور انتظار کر
سود و زیانِ زندگی دو روز کی ہے چاندنی
سب عارضی سب عارضی ایسا نہ کاروبار کر
دنیا سکوں کی کب ہے جا اس میں کروں گا رہ کے کیا
سمجھا جو میرا مدعا بولا کہ انتظار کر
ہے وقت سیلِ موج خیز دنیا ہے بحرِ تند و تیز
اور زندگی گوہر رضی گوہر کو آبدار کر

محمد الیاس شیخ
انٹر میتھس

اک رات جو کسی سے ملاقات ہو گئی
وہ رات میرے واسطے شب بھر رات ہو گئی

ہونٹوں پہ یوں تبسم رنگیں مچل گیا
گلشن میں جیسے پھولوں کی برسات ہو گئی

ان کے حسیں چہرے پہ زلفیں بکھر گئیں
گویا غروب ہو گیا دن رات ہو گئی

جذبات پر بو یک تلاطم بپا ہوا
شاید کسی حسیں سے ملاقات ہو گئی

الیاس جس نے عہد وفا اس طرح کیا
میرے لیے یہ زندگی سوغات ہو گئی

ہاشم معز الدین ہاشمی
انٹر میتھس

بکھرے ہوئے پتوں کو حقارت سے نہ دیکھو
ان سے ہی بہاروں کا کبھی حسن تھا سوچو!
پھر خوف اندھیروں کا کسی گھر میں نہ ہوگا
ہر دل میں محبت کی اگر شمع جلا دو!
اپنوں کے لئے اور بھی سو غم ہیں جہاں میں
لازم تو نہیں غم انھیں اپنے بھی سنا دو
اب وقت کی دھڑکن بھی ہم آہنگ ہے دل سے
ہاشم! تمہیں اب بھی جو شکایت ہو تو لب کھولو!

محمد اشفاق عاصم
انٹر بائیلوجی

معصوم سی بھولی بھالی سی
کچھ شوخ سی کچھ متوالی سی
گفتار میں بھی وہ شیریں سخن
اور خامشی میں تھی غنچہ دہن
ترشا ہوا بت وہ مرمر کا
کم گوئی بھی اسکی ہوش ربا
اور سارا پیکر تھا ایسا
دوجا نہیں کوئی اُس جیسا

عتیق جیلانی

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو اس میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے لوگ کسی نہ کسی مادرِ علمی کے ہونہار سپوت ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد نے بھی اپنے قیام سے اب تک ایسے بے شمار افراد پیدا کئے ہم نے ایسے ہی افراد میں سے اپنے سابق طالبعلم کی حیثیت سے عتیق جیلانی کا انتخاب کیا ہے۔

عتیق جیلانی ١٩٥٦ء میں پیدا ہوئے ١٩٧٢ء میں علامہ اقبال ہائی اسکول لطیف آباد سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد سے بی اے اور سندھ یونیورسٹی سے ١٩٨٠ء میں ایم اے اردو کی سند حاصل کی۔

کالج میں قیام کے دوران عتیق جیلانی نے کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور مختلف سالوں میں کالج یونین کے جوائنٹ اور جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔

انہوں نے ١٩٨١ء سے درس تدریس کے شعبے میں قدم رکھا۔ ایکسال کا کوآپریٹو ہائی اسکول لطیف آباد میں ١٩٨٢ء سے ١٩٨٨ء تک کیڈٹ کالج پٹارو میں خدمات انجام دیں اور ١٩٨٨ء سے شعبہ اردو جامع سندھ سے منسلک ہیں۔

عتیق کے نوجوان شعراء میں اپنا مقام رکھتے ہیں اپنے شعری سفر کا آغاز اسکول کے زمانہ طالب علمی میں کر دیا تھا لیکن بزم علیم ادب حیدرآباد کے قیام کے ساتھ ہی ملکی سطح پر کچھ جانا پہچانا جانے لگا۔ اس بزم کے آپ بانی ممبر ہیں اور اس کی صدارت کے تحت اقتدار جعفری کا دفتر ہے اب اسی بزم کے تحت نکلنے والے سہ ماہی رسالے کے مرتبین میں شامل ہیں۔

مطالعہ خصوصی

مرے لیے تو یہ دنیا کھلا تماشا ہے
میں اس جگہ ہوں یہ اس سے سوا تماشا ہے

کہیں ہجوم عناصر کے درمیاں ٹھہریں
ذرا سکون سے دیکھیں یہ کیا تماشا ہے

یہی حکایتِ ہجر و وصال ہے ہمہ عمر
جدھر نگاہ کریں ایک سا تماشا ہے

کچھ ایسا خوش تو نہیں ہوں میں اس جگہ لیکن
مجھے پسند شب و روز کا تماشا ہے

عتیق جیلانی

عتیق جیلانی

(سابق طالب علم)

نگارخانۂ دنیا میں اور کیا ہے مرا
یہ چند پھول ہیں میرے۔ یہ آئینہ ہے مرا

میرے دکھوں کا مداوا نہیں ہے یہ دنیا
مرا زمین پہ ہونا ہی مسئلہ ہے مرا

یہی ذرا سی کہانی ہے میرے ہونے کی
بس ایک ہجر میں جینا ہی واقعہ ہے مرا

ترے بغیر شب و روز کے تسلسل میں
مرا وجود اگر ہے تو واہمہ ہے مرا

عتیق جیلانی (سابق طالب علم)

میرا وجود زمان و مکاں سے بہتر ہے

یہ خاک ہے مگر اس خاکداں سے بہتر ہے
کوئی ملال نہیں ہے زمیں پہ ہونے کا
یہ کنجِ خاک مجھے آسماں سے بہتر ہے

رہا بسا ہوں میں اس کے ہر اک موسم میں
یہ اک جزیرۂ دل لامکاں سے بہتر ہے

سماعتیں ہوں معطل تو ایسے عالم میں
صراطِ صبر، فروغِ فغاں سے بہتر ہے

کسی ملال بھرے وقت سوچتا ہوں عتیق
ہر اک مقام، ہر اک سمت یاں سے بہتر ہے

عتیق جیلانی

بھروسہ ساعتِ درکار پر تھا
سو مدت سے دیا دیوار پر تھا

مرے اطراف بھی منظر بہت تھے
مگر دل دور کے اسرار پر تھا

زمین و آسماں ہاتھوں میں تھے اور
قدم اک ساعتِ دشوار پر تھا

سماعت اک مسلسل دکھ ہے اور میں
بہت دن سے اسی پرکار پر تھا

عتیق اپنے لئے کل آب و دانہ
اسی معمورۂ آزار پر تھا

عتیق جیلانی

مرا دل خاک پر باقی رہے گا
یہ پیالہ چاک پر باقی رہے گا

اگر مٹ جائیں گے تیرے خد و خال
تو کیا اس چاک پر باقی رہے گا

نشانِ موسمِ ابرِ و عنا دل
دل خود چاک پر باقی رہے گا

عتیق احمد یہ خوش آثار جگنو
خس و خاشاک پر باقی رہے گا

عتیق جیلانی

بادل مجھ سے آگے آگے اُڑتا جاتا تھا
میں روزانہ پیاسا آتا، پیاسا جاتا تھا

بڑھتے قدموں میں زنجیریں ڈالی جاتی تھیں
مجھ کو میرے گھر سے روز پکارا جاتا تھا

میں اپنی اک اک ساعت کا سب حاصلِ تفریق
خاموشی سے لوحِ جاں پر لکھتا جاتا تھا

لوگ گھروں میں بیٹھے مجھ پر ہنستے رہتے تھے
میں جنگل میں خوشبو لینے تنہا جاتا تھا

عتیق جیلانی

ماہ منیر و آبِ رواں دیکھتے رہے
کچھ دیکھنا ہی تھا سو یہاں دیکھتے رہے

اس شعلہ ادا نے توجہ نہ کی اِدھر
ہم دور تک وہ تختِ رواں دیکھتے رہے

کچھ رنگ ہم نے جمع کیے تھے سو عمر بھر
اپنے ہی دل میں ایک سماں دیکھتے رہے

پھر یوں ہوا کہ دیر تلک آسمان پر
بستی کے لوگ ایک نشاں دیکھتے رہے

کس شعبدے میں عمر بسر کر گئے عتیق
کیسا طلسم تھا جو یہاں دیکھتے رہے

آفتاب احمد۔ رضوان احمد۔ انٹر میتھس

ذوقِ سخن کی آزمائش

متعدد شعراء کے بعض مصرعے مشہور ہو کر زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں۔ اور ایک ہی مصرعے کے کثرتِ استعمال کا نتیجہ یہ نکلا کر عام طور پر شعر کا دوسرا مصرع ذہن و یادداشت سے محو ہو گیا۔

ہم نے آپ کے ذوقِ سخن کی آزمائش کیلئے چند ایسے ہی مشہور مصرعوں کا انتخاب کیا ہے۔ آپ دوسرے مصرعے یاد کیجئے تاکہ اشعار مکمل ہو سکیں۔ اگر آپ کو نوّے فیصد مصرعے یاد ہوں تو آپ کا ذوق قابلِ رشک ہے۔ اگر آپ کو ستّر فیصد مصرعے یاد ہوں تو بھی آپ قابلِ مبارکباد ہیں اور پچاس فیصد مصرعے یاد ہونے کی صورت میں آپ کے ذوق کو مناسب کہا جا سکتا ہے۔

۱:۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا ______ مومن
۲:۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ ______ امیر مینائی
۳:۔ کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے۔ ______ ذوق
۴:۔ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ ______ مجروح
۵:۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی ______ جلال
۶:۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ______ داغ
۷:۔ اب تو جلتے ہیں میکدے سے میر ______ میر تقی میر
۸:۔ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا ______ فراز
۹:۔ منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے ______ محسن بھوپالی
۱۰:۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ______ مادھو رام جوہر
۱۱:۔ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ ______ شیفتہ
۱۲:۔ اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے ______ اصغر گونڈوی
۱۳:۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا ______ غالب
۱۴:۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی ______ اقبال
۱۵:۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے ______ داغ
۱۶:۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ ______ فانی
۱۷:۔ انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ ______ مصطفیٰ زیدی
۱۸:۔ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ ______ داغ
۱۹:۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں ______ اقبال
۲۰:۔ سُرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد ______ ناسخ

انعام یافتگان

کالج کے مختلف مقابلوں میں انعام پانے والے طلباء

نام طالب علم	کلاس	مقابلہ	کیفیت/پوزیشن
۱- شاہد رحمان	فرسٹ ایئر بائیلوجی	حسنِ قرات	اول
۲- اشفاق احمد خان	″	″	دوم
۳- فرحان منصور	″	″	سوم
۴- فہیم جاوید	بی ایس سی سال اول	نعت خوانی	اوّل
۵- آصف غوری	فرسٹ ایئر میتھس	″	دوم
۶- عبدالحلیم	انٹر میتھس	″	سوم
۷- رضا عباس	بی ایس سی سال اول	تقاریر	اوّل
۸- حفظ الرحمٰن	انٹر میتھس	″	دوم
۹- عنایت اللہ	″	″	سوم
۱۰- سید سعید احمد	فرسٹ ایئر میتھس	مضمون نویسی (پہلا)	اوّل
۱۱- محمد ندیم جمیل	″	″	دوم
۱۲- شفیع الدین	فرسٹ ایئر بائیلوجی	″	سوم
۱۳- وقار حسین	″	مضمون نویسی (دوسرا)	اوّل
۱۴- محمد اشفاق عاصم	انٹر بائیلوجی	″	دوم
۱۵- فدا الرحمٰن	فرسٹ ایئر میتھس	″	سوم
۱۶- حفظ الرحمٰن	انٹر میتھس	معلوماتِ عامہ	اول
۱۷- محمد رفیق	فرسٹ ایئر میتھس	″	دوم
۱۸- عرفان سہیل	″	″	سوم
۱۹- اعجاز احمد زاہد	بی ایس سی سال اول	حسن خطاطی	اوّل
۲۰- مظہر احمد	فرسٹ ایئر آرٹس	″	دوم
۲۱- محمد طارق غوث	فرسٹ ایئر میتھس	″	سوم

گلستانِ نظم

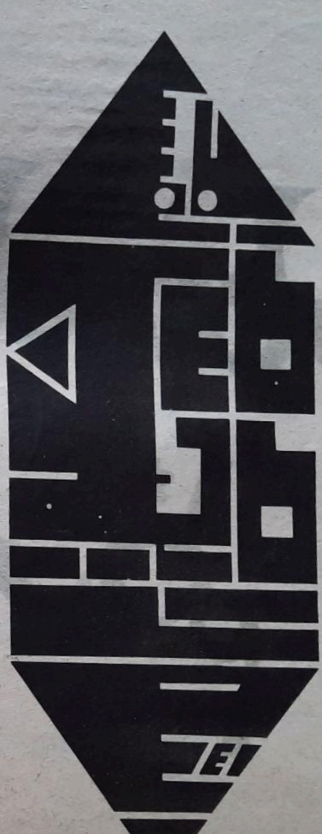

ظفر احمد
فرسٹ ایئر آرٹس

چودھری اعجاز احمد اعجاز
انٹر میتھس

کل اور آج

کل تو جواں مرد تھا آج ہے تو ننگِ مرد
شعلہ جو کل تند تھا آج پڑا ہے وہ سرد

قوم تھی کل سُرخ رو تجھ سے اور تو اُس سے تھا
آج ہے رنگ اس کا فق اور تیرا رنگ زرد

کل تو ثریا پہ تھا تیری خودی کا مقام
آج کیوں غیرت تیری ہو گئی راہوں کی گرد

اُن تھا مِلّت کی تو جان تھی مِلّت تیری
اُس کی تباہی پہ آج اُٹھتا نہیں دل میں درد؟

ایک زمانہ وہ تھا ایک زمانہ یہ ہے
کل تھے ہم اعجاز ایک آج ہوئے فردِ فرد

محمد حامد عزیز شیخ
انٹر آرٹس

نیا سال

نیا سال آیا ہے پھر زندگی میں
خوشی چھا گئی دیس کی ہر گلی میں
نئی آرزوئیں نئے ہیں ترانے
نئی زندگی کے نئے ہیں فسانے
کدورت کا ہر داغ دل سے مٹایا
مسرّت کا راحت کا پیغام لایا
پرندوں نے پیڑوں پہ ہے غُل مچایا
چمن کا ہر اک پھول ہے مسکرایا
اُٹھو نوجوانوں وطن کو سجاؤ
محبّت، اُخوت کے نغمے سناؤ
نئے سال میں حوصلے بھی نئے ہوں
نئی منزلیں راستے بھی نئے ہوں
ادب اپنا قائد ہے علم اپنا رہبر
زمانے میں کوئی نہ ہوتا اپنا ہمسر
لبوں پر یہ حامد کے آئیں دعائیں
نیا سال ہر سال یوں ہی منائیں

شہزادہ معین خان مظہر
انٹر بائیلوجی

احساس

اپنے دل سے میری تصویر مٹانے والے
مجھ کو جینے کا سلیقہ نہ سکھایا ہوتا
اپنی چاہت کا تو عادی نہ بنایا ہوتا
میرے خوابوں کو نہ رنگوں سے سجایا ہوتا
میرے جذبوں کو نہ خوشبو سے بسایا ہوتا
میں ہی نادان تھا اے مجھ کو بھلانے والے
تو نے دیکھا تو اسے میں تیری چاہت سمجھا
کتنا نادان تھا عادت کو عنایت سمجھا
تیرے انداز کو اظہار محبت سمجھا
اور محبت کو میری زیست کی دولت سمجھا
میرے گلزار محبت کو جلانے والے
دو گھڑی خواب کی حالت میں تو رہ لینے دے
غم فرقت کی اذیت کو تو سہہ لینے دے
آنکھ میں ٹھہرے ہوئے اشک تو بہہ لینے دے
دل کے دکھ درد کو لفظوں میں تو کہہ لینے دے
اپنے دل سے میری تصویر مٹانے والے

ہجوم نقش ہائے پا

محمد اشفاق عاصم
انٹر بائیلوجی

تم نے جس چوراہے پر
حالتِ تذبذب میں
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
کر لیا الگ رستہ
ڈھونڈ لی نئی منزل
میں اسی چوراہے پر
حالتِ تذبذب میں
آج بھی کھڑا تنہا
تک رہا ہوں رستوں کو
اور تمہارے قدموں کے
نقش ڈھونڈتا ہوں میں
پر تمام رستوں میں
بے شمار نقشِ پا
اک ہجوم کی صورت
ڈھونڈتی نگاہوں کو
راستہ نہیں دیتے۔

صحافی کی مصیبت

رضوان احمد
فرسٹ ائیر میتھس

سیٹھ کہتا ہے کہ کھاتوں میں خسارہ لکھو
لوگ کہتے ہیں کوئی فلمی شمارہ لکھو
واقعہ کتنا ہی تفصیل طلب ہو لیکن
مصلحت کا ہے تقاضا کہ اشارہ لکھو
ڈوب جائے کوئی دریا میں رپٹ میں اس کی
پولیس افسر کا یہ کہنا ہے کنارہ لکھو
کوئی بندوق کی گولی سے بھی مر جائے اگر
آلۂ قتل میں بس ایک شرارہ لکھو
دن دہاڑے بھی جو بازار میں ڈاکہ پڑ جائے
وقت کو دیکھ کے تم رات کے بارہ لکھو
لاکھ چوری میں بھرے گھر کا صفایا ہو جائے
قیمت مال میں روپے وہی بارہ لکھو
ہے صحافت کہ کہو آگ کو گلزار صفت
اور صداقت کہ شرارے کو شرارہ لکھو

انداز تیرا میرا

حارث علوی
فرسٹ ائیر بائیلوجی

تیرا ستم تیری جفا
سب کچھ روا سب کچھ بجا
لیکن رہے یہ دھیان میں
ضد بھی تو ہے انسان میں
میرا بھی اک انداز ہے
اپنی وفا پہ ناز ہے
تیرے ستم سہہ جاؤں گا
شکوہ نہ لب پر لاؤں گا
تیری جفا شرمائے گی
میری وفا اترائے گی
ایسی غزل گاؤں گا میں
پتھر کو پگھلاؤں گا میں
پھر تیرا دل اپنائے گا
مجھ کو ساحل مل جائے گا۔

کہانی

محبوب عالم
بی اے فائنل

میں ہوش کی منزل میں
قدم رکھ چکا تھا
اور وہ
ابھی گڑیوں سے کھیلتی تھی
اِک روز
بھولپن سے اُس نے کہا
آؤ گڈے گڑیا کا کھیل کھیلیں
تم بن جاؤ گڈا اور میں گڑیا
اور پھر اپنی بات پر
خود ہی شرما گئی
کئی سال بعد
جب میں شعور کی منزل کو پہنچا
میں نے اس سے کہا
تمہیں کچھ یاد ہے؟
تم نے کیا کہا تھا؟
اب اس خواب کی تعبیر کا وقت آپہنچا
اس کے چہرے پر حیا کی سُرخی چھا گئی
پھر منہ موڑ کر کہا۔
مجھے کچھ یاد نہیں
لیکن اسکی ہر ادا، اُس کا ہر انداز
میرے رازِ دل کا ترجمان رہا
پھر قسمت نے اُسے
کسی اور سے منسوب کر دیا۔
اس کے باوجود
اس کی ہر خوشی میری خوشی
اور اُسکا ہر غم میرا غم بن گیا۔
آج بھی دین و دنیا میں اس کی بھلائی کے لیے
دُعا گو ہوں
اور سوچتا ہوں
شاید وہ بھی اسی انداز میں سوچتی ہو۔
آج بھی جب کبھی
اُسے دیکھتا ہوں
تو بات کیے بغیر
اس کے چہرے کا ہر رنگ
اس کی حیا کی ہر خوشبو
اُس کی پلکوں کی ہر زباں
یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
مجھے اپنا کہا یاد ہے۔

محمد طارق غوث
فرسٹ ایئر میتھس

افسانے

افسانہ

عیدِ کا دن

حسین عابد : فرسٹ ایئر بائیلوجی

عید کے دن کا واقعہ اُس کے دل پر نقش ہوگیا ایسا نقش جو کبھی نہ مٹ سکے۔ جسطرح پتھر پر کھدا ہوا نقش نہیں مٹ سکتا۔ اسی طرح اُس کے دل سے عید کے دن کا واقعہ نہیں مٹ سکتا۔ عید آئی اور گذر گئی یوں جیسے کڑی دھوپ میں بدلی کا سایہ جو کچھ دیر کو ٹھہرے اور پھر آگے نکل جائے وہ چلتی ہوئی دلان سے کمرے میں آگئی اور اُس نے سوچا عید کا دن بھی اپنی جھولی میں ہزاروں خوشیاں، مسرتیں لے کر آتا ہے اور نہ جانے کتنوں کے دامن بھر کر گزر جاتا ہے۔ لوگ اپنی خوشیوں اور مسکراہٹوں کے درمیان کچھ دیر کو رک کر یہ بھی تو نہیں سوچتے کے اس دن کس کے ہونٹ مسرتوں کی مسکان سے محروم رہے، کس کی آنکھیں دل کے غبار سے نم ہوئیں۔ کس کے رخسار ماضی کی یادوں سے بھیگ گئے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی، سچ ہے کچھ دن یادوں کے اس قدر بھرپور برچھی ے کردار ہوتے ہیں کہ ان کے تصوّر ہی سے کلیجہ چھلنی اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اُس نے پھر سوچا "عید کا دن" بھی کچھ لوگوں کے حسین ماضی کا ایسا آئینہ بن کر آتا ہے کہ جس میں انہیں بہاروں کا سنگم، گلوں کی خوشبو کوئلوں کے گیت نظر آتے ہیں۔ اور پھر اُن کی نگاہوں میں خزاؤں کی اُداسی، کانٹوں کی چبھن اور حال کی تلخیاں گھوم جاتی ہیں۔ تب ہی ایسے لوگوں کے چہرے دھواں دھواں ہو کر ماضی کی اَن مٹ تحریر بن جاتے ہیں۔ وہ آپ ہی آپ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔ جس میں طنز کے لاکھوں تیر پوشیدہ تھے سردیوں کی چاندنی راتیں اور سردیوں کی عید دونوں ہی بے مزہ ہوتی ہیں۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ریحانہ نے اپنی کرسی آتش دان کے قریب کرتے ہوئے آگ کو تیز کر دیا۔ لکڑی سے راکھ جھاڑ کر جونہی آنچ بڑھائی، ماضی کی راکھ سے بھی یادوں کی چنگاریاں نکل کر شعلے بننے لگیں۔

ایسی ہی ایک سرد عید تھی جب اُسکی زندگی میں مسرتوں کا راج تھا۔ اُس کے من میں پریم کی آگ تازہ تھی اُس کی دھڑکنوں میں خوشیاں رچی بسی تھیں۔ وہ آج کے دن کسقدر خوش تھی۔ اُس نے اس دن کے لیے خاص اہتمام کیے تھے۔ ریشمی جوڑا اور اس پر سنہری کرن جس میں سنہری کامدانی کا کام، اُس کے قدم زمین پر تھے اور ذہن آسمان پر، مہندی سے سُرخ ہاتھوں میں پیلے زرد رنگ کی چوڑیاں، وہ اپنے آپ کو اپنے خیالوں کی حسین شہزادی تصور کر رہی تھی آخر یہ چوڑیاں اس کے لیے احمر ہی تو لاتا تھا۔ احمر اس کے من کا راجہ، ٹوٹ کر چاہنے والا خوبصورت نوجوان تھا اسے احمر پسند تھا اور احمر بھی اسے جی جان سے چاہتا تھا۔

اِس نے پہلو بدل کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا رات کی تاریکی نے سارے ماحول کو نگل لیا تھا اور فضاء میں پھیلی ہر جانب طویل خاموشی موت کی صدا بن گئی تھی اُس نے تازہ لکڑیاں آتش دان میں رکھیں۔ آنچ اونچی کی اور دھواں بل کھاتا انگڑائی لے کر آسمان کی سمت اُٹھا اور وہ آگ کے اُٹھتے ہوئے

شعلوں میں پھر اپنا ماضی تلاش کرنے لگی۔

ایک دن احمر نے اُس سے پوچھا تھا

ریحانہ! تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟

اور اُس نے جواب دیا تھا "جتنا سورج سمندر کو چاہتا ہے"۔

بس صرف بارہ گھنٹے کی چاہت اور وہ بھی ایسی جو بڑھتی، گھٹتی رہتی ہے۔

اُس نے خجالت سے ہنستے ہوئے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور پھر اُس نے پوچھا۔

احمر! تم مجھے کتنا چاہتے ہو؟

احمر نے کہا! ریحانہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں جتنا ساحل سمندر کو چاہتا ہے۔ ہر وقت ہر آن ہر گھڑی اور ہر موسم میں ساحل سمندر کو اپنی آغوش میں لیئے رہتا ہے اور میلوں دور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جہاں تک سمندر اس کا ساتھ دے۔

احمر نے اپنا کئی بار کا دہرایا ہوا جملہ پھر دہرایا تھا ریحانہ:۔ یاد رکھو میں تمہیں نہ پا سکا تو......... اور اُس نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں جملہ پورا ہی نہ ہو جائے اور وہ اسطرح ہر بار جملے کو پورا ہونے سے روکتی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس جملے کی تکمیل اسکا مقدر بن چکی ہے۔ جملہ پورا نہ ہوا مگر بات پوری ہوگئی۔ جس دن وہ اپنے خاندان کی عزت رکھنے کیلئے ڈولی میں سوار ہوئی اُسی دن اُسکا احمر ڈولے میں جھولتا ہوا، چار یاروں کے کاندھوں پر سوار نہ جانے کس منزل کی طرف ــــ جہاں سے لوٹنے کا کوئی راستہ نہیں تھا ــــ چل نکلا۔ شاید کسی ایسی منزل کی طرف جہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔ قدم پیچھے نہیں اُٹھتے، لوگ انتظار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، مگر جانے والا واپس نہیں لوٹتا۔ یہاں تک کہ منتظر لوگ بھی اسی منزل کے لیے اپنا انجانا ان دیکھا سفر شروع کر دیتے ہیں۔

اُس نے سوچا احمر کب کے منزل پر پہنچ گئے، میں آج بھی اپنی مردہ رُوح کے ساتھ زندگی کے دن گذار رہی ہوں، میری کوئی منزل نہیں، کوئی مقام نہیں، دنیا نے جسے میرا ہمسفر بنایا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلا گیا اور میں شکیل کے لئے نہیں بلکہ ایک زندگی کے لئے۔ فرحانہ کے لئے۔ اپنی بیٹی کے لیے آج بھی زندہ ہوں۔ اُس نے سوچا شکیل نے بھی مجھے کچھ نہ دیا اور جو کچھ بھی دیا وہ میرے کام کا نہیں۔ دولت اور فرحانہ!۔ دولت جو میرے لیے بیکار ہے۔ فرحانہ جو آج کل پاگل ہے۔ اُف! اُس نے سوچا وہ کتنی دکھی ہے اس دھرتی کی سب سے زیادہ دکھی سب سے زیادہ مظلوم ہستی، مگر اُس نے ایک عزم کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے اس کے باوجود جینا ہے۔ اپنی ماتما کے لیے اپنی اولاد ہی منزل ہے۔ وہی مقصد، وہی اُس کی تکمیل۔

آج صبح اُس نے فرحانہ سے صرف اتنا کہا تھا کہ بیٹی لو کپڑے بدل لو۔ آج تو اُتار دو ان میلے کپڑوں کو۔

کیوں ماں کیا بات ہے آج؟ فرحانہ نے اُداس آنکھوں سے سوال کیا تھا۔

"آج عید کا دن ہے نا بیٹی۔"

اور دوسرے ہی لمحے کمرے میں زلزلہ سا آگیا تھا، فرحانہ قہقہوں کی وجہ سے دوہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔

عید.........عید.........عید

وہ ہنس رہی تھی، وہ رو رہی تھی، وہ بے حال تھی، وہ نڈھال تھی۔

ریحانہ کی آنکھوں میں اسی تصور سے آنسو اُمنڈ آئے اور وہ ان گرم آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ماضی کی وادیوں میں کھو گئی۔ ایسا ہی ایک خوشگوار دن تھا۔ "عید کا دن" اس دن وہ اُداس تھی اور اُس کی بیٹی فرحانہ بہت خوش۔ اُس کے

ریشمی کپڑوں پر سنہری کرن لگائی تھی۔ جس پر سنہری گوٹے کا کام ہوا تھا۔ اور مہندی لگے ہاتھوں میں ہلکے سبز رنگ کی چوڑیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں اور وہ اپنی مسرتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس حقیقت سے بے پرواہ کہ اس کی ماں غموں کے بے پناہ بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔

ابھی لے گھنٹی بجی اور ریحانہ نے دروازہ کھولا تو ڈاکئے نے اُسے پارسل دیا تو ریحانہ حیرت زدہ ہو گئی اور اُس نے پوری قوت سے فرحانہ کو آواز دی۔

کیا ہے ممی!

یہ انجم کون ہے؟

یہ! یہ وہ بوکھلا سی گئی اور کچھ نہ کہہ سکی۔

میں پوچھتی ہوں کون ہے یہ؟

مجھے معلوم نہیں۔ اُس نے خوف سے جھوٹ بولا۔

تم جھوٹ بولتی ہو، اور اُس نے یہ عید کارڈ تمہیں کیوں بھیجا ہے؟ اور پھر اُسکے ایک بھرپور طمانچے نے فرحانہ کے پھول جیسے نازک گالوں کو انگارہ بنا دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، ماں سے نہ رہا گیا۔ دوسرے ہی لمحے مامتا نے اور پھر اپنے ماضی نے بھڑکایا اور اُس نے آگے بڑھ کر معصوم کلی کو اپنے تجربے کے سائے میں لے لیا۔ کیا تم! کیا تم اُسے چاہتی ہو بیٹی؟ مجھ سے جھوٹ نہ بولو سچ سچ بتا دو میں تمہاری ماں ہوں اور وہ گردن ہلا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور ماں کو اپنی بات کا جواب مل چکا تھا۔ ریحانہ نے اُسی وقت لاہور فون کیا اور کہہ دیا کہ وہ اپنی بچی کی شادی شاہد سے ہرگز نہیں کرے گی۔ منگنی کو ختم سمجھا جائے۔ مختصر بات کے بعد فون کا رابطہ بند کر دیا گیا اور اُس نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے اُس نے جنگ جیت لی ہو۔ اپنی "انا" کی جنگ۔ اپنے احساس کی جنگ۔ اپنے ماضی کی جنگ۔

دوسرے ہی دن اُسے تار کے ذریعہ اطلاع ملی کہ شاہد نے خودکشی کر لی ہے۔ اور اس خبر کے ساتھ ہی "ریحانہ منزل" کے در و دیوار ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ "ریحانہ منزل" بجلیوں کی زد میں تھا اور اسے بچانے والا کوئی نہ تھا کوئی بھی نہیں، تار پڑھ کر فرحانہ قہقہے لگا رہی تھی۔ اپنے سر کے بالوں کو نوچے ڈال رہی تھی، کپڑے پھاڑ رہی تھی اور سارے محلے والے اُس کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ یہ ساری باتیں اتنی جلدی میں ہوئیں کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کی راہ کے کانٹے اپنی پلکوں سے صاف کر دیے ہیں اسے کیا معلوم تھا کہ خود اُس کی جلدی نے اپنی بیٹی کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ مگر اس میں اسکا بھی قصور نہیں تھا۔ خود فرحانہ اور شاہد کی ہی تو غلطی تھی۔ اب اسے کیا معلوم کہ وہ ڈر کی وجہ سے فرضی ناموں سے مراسلت کرتے ہیں۔ اور یہ انجم بھی دراصل شاہد ہی کا دوسرا نام تھا۔ کل عید تھی اور آج محرم۔

ایک سال گزرنے کے بعد آج پھر وہی عید کا دن تھا اور "ریحانہ منزل" کا ماتم کدہ!

فرق صرف اتنا تھا کہ پچھلے سال اس گھر میں ایک.. غم زدہ تھا اور آج دو۔

آتش دان کی آگ مکمل طور پر سرد ہو کر راکھ کے ڈھیر میں بدل چکی تھی ایسے ڈھیر میں، جس میں کوئی چنگاری نہ ہو۔ ریحانہ کی گردن فرحانہ کے کمرے کی طرف ہمیشہ کے لیے ڈھلک چکی تھی اور فرحانہ کے قہقہے آسمان کو ہلا رہے تھے۔ جیسے وہ آسمان سے صبح کی بھیک مانگ رہے ہوں۔ حسین صبح کی روشن صبح کی، ایسی صبح جو سچی خوشی بخش سکے، ایسی صبح نہیں جو عید کے نام پر غموں کے انگارے برسائے۔

نیا راستہ

شہزادہ معین خان مظہر
انڑ باٹیلوچی

آخر وہ بے چارہ کیا کرتا۔ غربت نے اُسکی تمام آرزوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ افلاس کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ آج اس کے پاس ماضی کی یاد کے سوا کچھ بھی نہیں پچھلے دنوں کی یاد ہی اسکا سرمایہ اور پونجی تھی۔ وہ چلتا رہا ایک نامعلوم منزل کی طرف اس منزل کی طرف جہاں کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور اسکی آنکھوں سے جو دنیا میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی، آنسوؤں کے چند بے کار قطرے گر پڑے۔ جن کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں کوئی وقعت نہیں اور آج سے چند سال پہلے کے واقعات اسکی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ جب ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان بن گیا۔ وہ پاکستان آیا اور اپنے وطن شہر کو چھوڑ کر اپنی بیوی اسماء اور دس سالہ عدنان سمیت نکل کھڑا ہوا ایک قافلہ کے ساتھ اور جب وہ پاکستان پہنچا تو یہاں بھی وہی تلخ اور وہی گردش، نہ روزگار کا سامان اور نہ کوئی وسیلہ اس نے بہت کوشش کی کہ کہیں ملازم ہو جائے مگر ہزاروں دفتروں اور فرموں کے چکر کاٹنے کے بعد بھی نتیجہ وہی نکلا جسکی اُسے بالکل اُمید نہیں تھی۔ یعنی کوئی آسامی خالی نہیں کے زہریلے جواب سے اسکا دل توڑ دیا جاتا تھا۔

اسماء اسکی بیوی ایک وفادار سلیقہ شعار عورت تھی اُس نے مصیبت اور افلاس کے زمانہ میں بھی خاوند کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اُس نے محنت مزدوری کی۔ لوگوں کے برتن مانجھے جس سے چند دن ان کا گذارہ چلتا رہا۔ لیکن سخت محنت کے باعث وہ بیمار ہو گئی، کھلا ہوا پھول مرجھا گیا۔ چہرے پر تاریکی چھا گئی۔ سردی لگ جانے سے نمونیہ کے آہنی پنجوں نے اُسے آدبوچا۔ ان کے پاس کھانے کے لیے بھی کوئی چیز نہ تھی دوا کہاں سے کرتے۔ ایک دفعہ وہ سارا دن صبح سے شام تک سڑکوں پر بھٹکتا رہا کہ کہیں سے مزدوری حاصل کر سکے جس سے اپنی اسماء کا علاج کرے۔ مگر ہائے قسمت کہ ہر طرف سے اُسے ناکامی کا بھیانک منہ دیکھنا پڑا۔

غربت نے اسماء کو زیادہ دن اسکے پاس دنیا میں رہنے نہ دیا اور وہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ وہ ایسی جگہ گئی جہاں جا کر آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ ماں کی جدائی کے صدمے سے عدنان بے چارہ بھی بیمار ہو گیا۔ اب اس کی کشتی پوری طرح بھنور میں تھی۔ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے بھیک؟

ایک دفعہ اچانک اسکا چہرہ مایوسی کے ملے جلے جذبات سے تمتما اُٹھا۔ بھیک... اُس نے سوچا نہیں نہیں وہ بھیک نہیں مانگے گا۔ اور آج کے زمانے میں اُسے بھیک دے گا بھی کون وہ فاقہ کر سکتا تھا۔ مگر عدنان کی بیماری اس سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔

اور وہ عدنان کی زندگی کی بھیک مانگنے کیلئے

ڈاکٹر کی طرف چل پڑا ! مگر کیا ڈاکٹر جو کہ شہر میں بھی رحم دل اور سخی مشہور تھا، غریب کا علاج کرنے کے بجائے زرداروں کا علاج کر رہا تھا۔ ان لوگوں کا جو اس کے ہاتھوں میں چند کھنکھناتے ہوئے سکے دے رہے تھے۔ اس کی صدا پر وہ بگڑ گیا۔ اُسکے ماتھے کی تیوریاں چڑھ گئیں اور بے جا بے ڈاکٹر گرج کر بولا۔ اگر تجھ جیسے ہٹے کٹوں کو مفت دوائی دیتا رہوں تو میرے شفاخانے کا اللہ ہی ملی، محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے ماشاء اللہ جوان ہو۔ آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھی ہے۔ اور وہ یہاں سے خالی ہاتھ لوٹا۔ اب اس کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلائے وہ سوچتا تھا کہ لوگ اسے محنت مزدوری کیلئے کیوں کہتے ہیں۔ جبکہ کئی دفعہ تلاش کے باوجود بھی اسے مزدوری نہیں ملی۔ آخر وہ گھڑی آن پہونچی جب عدنان بھی اسے روتا دھوتا چھوڑ کر ابدی نیند سو گیا۔ اور آج وہ اپنا سب کچھ لٹا کے جا رہا تھا کہاں؟ یہ اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ ایسے بھٹکے ہوئے راہی کی طرح تھا جو گم ہو اور سرگرداں ہو مگر منزل اس سے کوسوں دور ہو۔ وہ ایسی زندگی سے تنگ آچکا تھا جس میں سوائے رنج و غم مصائب اور آلام کے سوا کچھ نہ ہو وہ موت کو ایسی زندگی سے بہتر جانتا تھا جس میں غربت اور افلاس کے کانٹے ہر گام پر اسکا راستہ روکتے ہوں۔ اب وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے آج وہ ایک نیا راستہ اختیار کر رہا تھا وہ ایک ایسی جگہ جا رہا تھا جہاں اسے زندگی کی تلخی سے سکون و آرام ملنے کی توقع تھی جہاں وہ غربت افلاس سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔

سنسان سڑک کا آخری موڑ طے کرنے کے بعد وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ موجیں اُس کے استقبال کے لیے اُٹھیں اور پھر بیٹھ گئیں اور اسی طرح ہوتا رہا۔ وہ اس مد و جزر کو اسی طرح دیکھتا رہا۔ جسطرح وہ اس سے قبل زندگی کے اُتار چڑھاؤ دیکھ چکا تھا۔ پانی کے اس دھارے میں اس نے اسطرح ہزاروں چھوٹے چھوٹے تنکوں کو بہتے ہوئے دیکھا جسطرح وقت کا سیل رواں کئی انسانوں کو خاک میں ملا چکا تھا۔ چھپاکے کی آواز آئی دریا کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا۔ پانی کے چھینٹے اُڑے چند منٹ بعد اسکا جسم تھوڑی دیر کیلئے اُبھرا اور پانی کی سطح پھر برابر ہو گئی وہ اپنی منزل پا چکا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔

مُفکّرین کے اَقوال

سیّد وسیم الحسن

سیکنڈ ائیر بائیولوجی

۱:۔ قناعت :۔ سب سے بڑی دولت ہے۔

انتقام کے طور طریقوں پر غور کرنے سے اپنے ہی زخم ہرے ہوتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

۲:۔ حریص آدمی دنیا لیکر بھی بھوکا ہے اور قانع آدمی ایک روٹی سے بھی پیٹ بھر لیتا ہے۔

(حضرت شیخ سعدیؒ)

۳:۔ راستہ پوچھنے سے مت شرماؤ ورنہ راستہ کھو بیٹھو گے۔

(ملائی ادب)

۴:۔ تم اس وقت تک کامیاب نہیں جب تک تمہارے دشمن تم پر اعتبار نہ کریں۔ (سقراط)

۵:۔ انسان عقل سے پہچانا جاتا ہے شکل سے نہیں۔

(البیرونی)

۶:۔ بات میں نرمی اختیار کرو۔ کیونکہ لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے (حضرت امام غزالیؒ)

ایک مصنف ۳ افسانے

عارف مجید عارف ہمارے اُن ہونہار طالب علموں میں سرفہرست ہیں جو ایک طویل عرصے سے مختلف اخبارات اور رسائل میں بچوں کے صفحات کیلئے لکھتے رہے ہیں۔ اب تک ان کی نگارشات روزنامہ امن، جسارت، جنگ اور اخبارِ جہاں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے موضوعات میں افسانے، اُبھرتے ہوئے کھلاڑیوں کے تعارف، مختلف کھیلوں کی تاریخ اور مضامین شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر عارف اسی لگن اور شوق سے لکھتے رہے تو جلد ہی ادب میں اپنا مناسب مقام بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم اپنے میگزین میں ان کے تین افسانے جن میں دو مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ افسانہ ہے شامل کر رہے ہیں۔

(مدیر اُردو)

سچے رشتے

تحریر:۔ عارف مجید عارف (سال اوّل میتھ)

روزنامہ جسارت ۳ اگست ۱۹۸۴ء

پانچویں کلاس میں اس وقت بڑا شور ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کلاس کو اُردو پڑھانے والے ٹیچر زبیر صاحب آج اسکول نہیں آئے تھے اور جس ٹیچر کو ان کی جگہ کلاس لینے بھیجا گیا تھا اُن کو بھی چند منٹ پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔ اس لئے کلاس کو وہ مانیٹر کی زیر نگرانی چھوڑ گئے تھے۔ لیکن بھلا لڑکے کہیں ایک لڑکے سے سنبھلنے والے ہیں۔ اس لیے سب لڑکے آپس میں بات چیت کرنے میں معروف تھے۔ کہیں زیر گفتگو موضوع گذشتہ رات ٹیلی ویژن پر آنے والا ڈرامہ تھا۔ جبکہ کچھ زبیر صاحب کی غیر حاضری پر تبادلہ خیال کر رہے تھے جبکہ عامر اور ندیم میں زیر بحث

موضوع پاکستان کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں جاوید میاں داد اور ظہیر عباس میں سے اچھا بیٹسمین کون تھا؟ عامر کو ظہیر عباس بے حد پسند تھا۔ جب کہ ندیم میاں داد کو پسند کرتا تھا۔

"تمہیں جاوید کی وہ اننگ تو یاد ہوگی جس میں اُس نے ۲۸۰ رنز بنائے تھے۔" ندیم بولا۔

"ہاں یاد ہے۔" عامر نے جواب دیا۔ "لیکن تم ظہیر عبّاس کی ۲۷۴ رنز والی اننگز بھول رہے ہو۔"

"مگر میانداد نے ظہیر سے ۶ رنز زیادہ اسکور کئے تھے۔" ندیم نے اُسے بتایا۔

"یہ درست ہے۔" عامر بولا لیکن ندیم تم یہ مت بھولو کہ ظہیر نے یہ اسکور اپنی زندگی کے دوسرے ہی ٹیسٹ میں کیا تھا جبکہ جاوید ۲۸۰ رنز بناتے وقت پچاس سے زیادہ میچ کھیل چکا تھا۔" عامر نے ظہیر کے حق میں بولتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ بات تو تمہیں تسلیم کرنی ہی ہوگی کہ جاوید کا بیٹنگ اسٹائل کتنا خوبصورت ہے۔ خصوصاً اسٹریٹ ڈرائیو......" ندیم نے ہار نہ مانی۔

"اوہو! تم ظہیر کے اسٹریٹ ڈرائیو بھول گئے کیا! اچھا دیکھو میں تمہیں بتاؤں کہ ظہیر اسٹریٹ ڈرائیو کس طرح کھیلتا ہے۔" یہ کہہ کر عامر نے ندیم کی تختی اُٹھائی اور پوری قوت سے اُسے "بیٹ" سمجھتے ہوئے ظہیر کے انداز میں گھمایا۔ یکایک "تڑاخ" کی آواز آئی اور تختی برابر والی ڈیسک کے کونے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ تختی یہ حالت دیکھ کر ندیم بے قابو ہو گیا اور عامر سے تیز آواز میں بولا۔

"عامر! تم نے میری تختی کیوں توڑ دی .... تم نے ضرور جان بوجھ کر توڑی ہے۔ کیونکہ یہ تختی تم آپا جان سے حاصل نہ کر پا رہے تھے۔ تم میرے پاس تختی دیکھ کر جلتے تھے اور آخر کار تم نے اُسے توڑ ہی دیا۔"

عامر نے جب اپنے اُوپر الزام لگا دیکھا تو تڑاخ سے ایک تھپڑ ندیم کے رخسار پر جڑ دیا۔

تھپڑ کھا کر ندیم غصّے اور جوش سے سُرخ ہو گیا ___ لیکن وہ غصّے کو دبا گیا، اور عامر سے کسی قسم کی کوئی بات کئے بغیر چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر چھٹی کے وقت تک اُن میں کوئی بات نہ ہوئی۔

عامر اور ندیم بے حد گہرے دوست تھے۔ ندیم ایک بہت ہی مال دار باپ کا بیٹا تھا۔ جبکہ عامر ایک انتہائی غریب راج کا بیٹا تھا، جس کے لیے دو وقت کھانا بھی بہت مشکل ہو جایا کرتا تھا۔

عامر اور ندیم میں دولت کا کوئی فرق نہ تھا۔ ندیم اور اس کے والدین عامر کو بے حد پسند کرتے تھے۔ جو تختی عامر نے توڑ دی تھی، وہ ندیم کی آپا نے ان دونوں میں سے اس کے لئے انعام قرار دیا تھا جس کے اُردو میں زائد نمبر ہوتے۔ ندیم نے عامر سے تین نمبر زیادہ لے کر یہ تختی حاصل کر لی تھی۔ جبکہ عامر کو انعام میں کاپی دی گئی تھی۔ عامر نے تختی توڑ دی تو ندیم ...

ذہن میں یہی خیال کیا تھا کہ عامر نے جان بوجھ کر تختی توڑ دی ہے۔ تاکہ ایک کے پاس نہ ہو تو دوسرے کے پاس بھی نہیں۔ اس تختی کی وجہ سے اب ان کی چار سالہ پرانی دوستی ختم ہو چکی تھی۔ ندیم جب گھر لوٹا تو اُسے بہت دکھ تھا کہ عامر نے ایسا کر کے اُس سے دوستی ختم کر لی۔ وہ عامر کو اپنے بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ عامر سے لڑائی کی وجہ سے وہ اُداس ہو گیا۔ اُس کے سر میں درد شروع ہو گیا، جس نے رات کو بخار کی شکل اختیار کر لی۔ ندیم کو مکمل یقین تھا کہ عامر ضرور اس سے ملنے آئے گا مگر عامر اس سے ملنے نہیں آیا۔ جبکہ وہ روزانہ کم از کم دو تین دفعہ اس سے ضرور ملنے آیا کرتا تھا۔ ندیم کے بخار نے اُسے دو دن تک اسکول جانے کی اجازت نہ دی۔ اِن دو دنوں میں بھی عامر اس کی خبر لینے نہ آیا تو ندیم کو بہت دکھ ہوا۔

صحت یاب ہونے کے بعد ندیم جب اسکول پہنچا تو پوری کلاس نے اُسکی خیریت دریافت کی۔ جب کہ عامر نے ایک نظر ڈال کر منہ پھیر لیا۔ یہ کیفیت تمام دن رہی اور نہ ہی ندیم نے اس سے بات کرنے میں پہل کرنے کا خیال کیا۔ حالانکہ دونوں کی بینچیں برابر تھیں۔ لیکن ان میں ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہ ہو سکا۔ اسی کیفیت میں چھٹی ہو گئی۔ عامر بھی اسکول سے باہر نکلا۔ ندیم اُس سے کچھ پیچھے تھا۔ عامر بڑے اطمینان اور خوشی کے ساتھ تختی ہوا میں لہراتا ہوا جا رہا تھا۔ کچھ آگے چل کر اچانک وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ اور تختی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس سے پہلے کہ عامر اُٹھتا اور تختی سنبھالتا ایک کار اس کی تختی کو روندتی ہوئی گزر گئی۔ عامر تختی کا یہ حال دیکھ کر رو پڑا اُس کو یہ بھی ڈر تھا کہ گھر جا کر تختی کے ٹوٹنے کی بات کیسے بتائے گا۔ نہ جانے اس کے باپ کو کتنا دکھ ہو۔ اور نہ جانے کب تختی کے لئے اس کے باپ کے پاس ۱۰ روپے یومیہ خرچ کے علاوہ ہونگے۔ جب تک بھلا وہ کس پر لکھے گا۔ ماسٹر صاحب اُسے روز کھڑا رکھیں گے۔ اس کی کتنی بے عزتی ہوگی۔ ندیم مجھے بغیر تختی کے دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔

اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا وہ ٹوٹی ہوئی تختی کی طرف حسرت بھری نظر ڈالتا ہوا بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن عامر تختی کا بندوبست نہ کر سکا تھا۔ اسی لیے وہ وقت سے پہلے ہی اسکول جانے لگا تا کہ ماسٹر صاحب کو تنہائی میں تمام صورتحال بتا کر کچھ دن کی مہلت مانگ لے ___ جب وہ اپنی کلاس میں داخل ہوا تو کلاس خالی تھی اس نے بستہ رکھنے کے لیے اپنی بینچ کے نچلے خانے میں ہاتھ ڈالا تو بستہ کسی چیز سے ٹکرا کر پورا داخل نہ ہو سکا۔ اُس نے بستہ نکال کر اپنا ہاتھ وہاں ڈالا تو ایک چیز اُس کے ہاتھ سے ٹکرائی اُس نے ہاتھ باہر نکالا تو اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی تختی تھی اور تختی کے دستے پر لکھا تھا "عامر کے لئے"۔ عامر نے سوچا کہ یہ تختی کس نے دی ہے۔ کیا ندیم نے؟ نہیں اُس کے دل نے تردید کی کہ ندیم کی تختی تو میں نے توڑ دی تھی وہ بھلا کیوں تختی دینے لگا۔ اُس نے سوچا سب کی بینچیں دیکھوں۔ جو آیا ہوگا ظاہر ہے تختی وہی لایا ہوگا۔ اتنا ...

باقی صفحہ نمبر ۲۵ پر

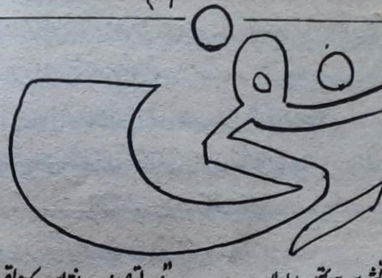

عارف مجید عارف
فرسٹ ایئر میمس

آرٹس کونسل میں پینٹنگز کی نمائش ہو رہی تھی سارا ہال تصویروں اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا انہی لوگوں میں پینٹنگز کی خالق سیما نگہت بھی تھی۔

ایک خستہ حال صحافی آفتاب بھی ان پینٹنگز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے بالکل نیا نیا ایم اے صحافت کر کے نکلا تھا اور ایک علاقائی اخبار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہفت روزہ اخبار میں کالم بھی لکھتا تھا اور اپنے اخبار کیلئے اسے آج اچھا مواد مل گیا تھا۔

اگلے ہفتے اس ہفت روزہ میں نمائش پر ایک کڑی تنقید شائع ہوئی۔ سیما نگہت نے جب وہ مضمون دیکھا اور اپنی تصاویر کا پوسٹ مارٹم ملاحظہ کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی اور تیر کی طرح سیدھی ہفت روزہ کے دفتر میں جا پہنچی۔

"یہ تبصرہ آپ نے لکھا ہے؟" سیما نے آفتاب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! فرمائیے" آفتاب نے جواب دیا۔

"میں! میں سیما نگہت ہوں۔"

اوہ تو آپ ہیں سیما نگہت۔

جی! اور آپ سے یہ کہنے آئی ہوں کہ آپ پینٹنگز کی الف، ب بھی نہیں جانتے بلکہ آپ تو شاید آرٹ کے معنی بھی نہیں سمجھتے ہوں گے۔"

"میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو تصویر دل میں کشش پیدا نہ کر سکے وہ تصویر ہی نہیں ہوتی محض آڑی ترچھی لکیریں ہوتی ہیں اور دوسروں پر رعب جمانے کا کام کرتی ہیں۔

"ہونہہ! تو آپ تصویر میں مقصدیت تلاش کرتے ہیں۔" سیما نگہت جھنجھلا رہی تھی۔

"آپ اس وقت غصے میں ہیں پھر کسی وقت ملیے اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ مجھے اس وقت بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

"پھر کبھی کیوں۔! آج کیوں نہیں۔" سیما نگہت فیصلے پر تلی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے شام کو ملیں گے" آفتاب نے فی الحال بحث ختم کر دی۔

شام کو دونوں انٹر کانٹی نینٹل کے لان میں بیٹھے بحث میں مشغول تھے۔

آپ کا مسئلہ بس یہ ہے کہ آپ ابھی اپنے آپ پر بھی واضح نہیں ہیں، ایک پروگریسو اپروچ رکھتے ہوئے بھی رومانٹک اور بورژوائی باتیں کرتی ہیں۔ ایک طرف مصوری کرتی ہیں دوسری طرف بحث کرتی ہیں اور پھر شاعری میں بھی ٹانگ اڑاتی ہیں۔ کب تک یونہی بھٹکتی رہیں گی" آفتاب نے اس کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں" اس نے مختصر جواب دیا۔

ساری لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خاص طور پر آپ جیسی کہ حسین بھی ہیں اور نرگسیت میں قید بھی۔"

"میں تو سدا سے ایسی ہی ہوں،" سیما نگہت نے کہا۔

"آپ خیالی دنیا میں رہتی ہیں کیا؟"

ہاں مگر میں حال میں بھی موجود ہوں۔"

"اوہ! تو آپ حال میں بھی ہیں اور خیالوں میں بھی آپ کو اپنی نفی کر لینی چاہیے۔ میرا مطلب ہے آپ کو صرف حال میں ہی رہنا چاہیے پھر"

"پھر؟"

"پھر آپ کو زندگی نئی لگے گی۔ آپ اپنے وجود سے اپنی انا سے باہر تو نکلیں ورنہ آپ قائم نہیں رہ سکتیں۔"

شام گہری ہو گئی تھی اور پھر اسی طرح کئی شامیں سیما کی آنکھوں کی طرح گہری ہوتی گئیں اب وہ گہرے دوست بن گئے تھے لیکن اب بھی اپنے اپنے نظریات پر قائم تھے۔

ایسی ہی ایک شام میں آفتاب نے سیما کو بتایا کہ وہ امریکہ جا رہا ہے کیونکہ اسے صحافت کی مزید تعلیم حاصل کرنے کا اسکالرشپ ملا ہے تو سیما چپ سی رہ گئی۔

تین سال گزر گئے پھر آفتاب واپس آ گیا ایک خوبصورت جوان بن کر۔ اب وہ ایک ہفت روزہ کا ایڈیٹر اور شراکت دار تھا۔ اس کی تقرری پر ایک پروقار تقریب ہوئی سینکڑوں لوگ تھے لیکن آفتاب کی نگاہیں کسی کی متلاشی تھیں بالآخر وہ مل گئی ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی۔

"یہ تم ہو! سیما نگہت" آفتاب کے منہ سے نکلا۔ سیما کے چہرے پر اب چیچک کے داغ تھے اور آنکھوں پر موٹے شیشوں والی عینک، ٹائیفائیڈ اور چیچک نے اس کا سارا حسن چھین لیا تھا۔

"ہاں میں ہی ہوں! وہی سیما نگہت جسے اپنے حسن پر ناز تھا جس کی آنکھیں جھیل سے زیادہ گہری تھیں جس کے گال انار سے زیادہ سرخ تھے اب وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی ہے اور ایک کالج میں معمولی لیکچرار ہے۔"

آفتاب کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے وہ بت بنا تحمل کے ساتھ سنتا رہا۔

"میں اس سیما نگہت کی نفی ہوں جس سے تم تین سال قبل ملے تھے اب میری نرگسیت تتلی کے پروں کی طرح اڑ چکی ہے مگر تم پریشان کیوں ہو؟ میں تو پریشان نہیں اور اب میں تم سے شادی کیلئے نہیں کہوں گی۔ اگر تم مجھ سے شادی کرو گے بھی تو ظاہر ہے مجھ پر ترس کھا کر ہی کرو گے...... ہے نا...... اور دیکھو یہ فلم تو ہے نہیں کہ تم اس صدمے سے فلمی ہیرو کی طرح فوراً دریا میں کود کر جان دیدو....

"نہیں ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ اپنی اپنی زندگی میں اپنے اپنے دائرے میں علامت بن کر۔"

سیما سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن آفتاب کیا جواب دیتا وہ تو خود اپنی نفی کر چکا تھا یعنی اپنے خیالات کو بدل کر امریکہ سے ایک نیا گلیمر روپ لیکر آیا تھا وہ بھلا کہہ بھی کیا سکتا تھا.....

سب سے زیادہ زیر مطالعہ کتاب

دنیا کی کوئی کتاب اتنی نہیں پڑھی جاتی جتنا قرآن پڑھا جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ بائیبل کی جلدیں زیادہ فروخت ہوتی ہوں لیکن پیغمبر اسلام کے کروڑوں پیرو قرآن کی لمبی لمبی آیات دن میں پانچ مرتبہ اس وقت سے پڑھنا شروع کرتے ہیں جب وقت سے وہ دو باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ (چارلس فرانسس پوٹر)

وہ ایک لمحہ

عارف مجید عارف
فرسٹ ائیر میتھس

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ڈویژن کی کرکٹ ٹیم کے لئے ٹرائلز دے دینا چاہئیں"۔ عمران نے نیٹ پریکٹس سے گھر کو لوٹتے ہوئے اپنے ساتھی کرکٹر ندیم سے کہا۔

"ہاں بھئی! عمران تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم لوگوں کا کھیل ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم لوگ ڈویژن کی نمائندگی کر سکیں گے"۔ ندیم نے جواباً کہا۔

"ہونہہ! ویسے بھی ڈویژن کو بیٹنگ کی ضرورت ہے گذشتہ سال ڈویژن کی کارکردگی بیٹنگ نہ ہونے کے باعث ہی تو کمزور رہی تھی"۔

"یہ بات تو تم نے بالکل درست کہی ہے۔ کرکٹ میگزین میں میں نے پڑھا تھا کہ ڈویژن نے گیارہ میچز میں بولنگ میں ۳۹ اور بیٹنگ میں صرف ۱۳ پوائنٹس حاصل کئے تھے۔ اگر بیٹنگ اچھی ہوتی تو یہی پوائنٹس ۴۰ سے کم تو ہرگز نہ ہوتے"۔ ندیم نے عمران کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے دونوں دوست مغرب کے بعد اپنے اپنے گھروں تک پہنچ گئے۔

عمران اور ندیم کی دوستی ساتویں کلاس میں ہوئی تھی اب وہ یونیورسٹی میں تھے اور ان کی دوستی روزِ اوّل کی طرح تازہ دم تھی۔ دونوں ہی کرکٹ کے اچھے کھلاڑی ہونے کے ناطے یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ ان دنوں یونیورسٹی گراؤنڈ پر انٹر یونیورسٹی کرکٹ چیمپئن شپ کے سلسلے میں پریکٹس نیٹ لگے ہوئے تھے ان کا شمار پھرتیلے اور چابکدست فیلڈرز میں بھی ہوتا تھا جبکہ عمران کبھی کبھی گیند بھی کرا لیا کرتا تھا۔

عمران کی ایک اور کلاس فیلو۔ نجمہ۔ عمران اور نجمہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اسی قربت کی وجہ سے ان کے درمیان ایک اور کرن چمک اٹھی تھی — محبت کرن — ایک دن وہ دونوں ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے —

"دیکھو عمران! تمھیں معلوم ہے کہ میرے ڈیڈی کتنے پریکٹیکل انسان ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا شخص ان کا داماد بنے جو صرف کھیل کے بل بوتے پر زندگی گذارنا چاہتا ہو پھر تم تو ابھی ایک پروفیشنل کرکٹر بنے بھی نہیں ہو میں مانتی ہوں کہ تم ایک باصلاحیت کھلاڑی ہو اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم ایک دن قومی کرکٹ ٹیم کی نمائندگی کرو گے۔ لیکن میرے ڈیڈی ڈیڈی چاہتے ہیں کہ تم اس قابل بنو کہ ایک اچھی زندگی گذار سکو"۔

"تمہاری باتیں بالکل درست ہیں نجمہ! اور تمہارے

ڈیڈی بھی بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن تمھیں معلوم ہے کہ مجھے کتنی مشکلات کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں معمولی سی نوکری ملی ہے اگر میں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجّہ دی تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ ہی کما ڈوں گا ناں۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ آج کل تعلیم کے ساتھ اچھی سفارش کا ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔ تبھی آدمی کو ملازمت مل پاتی ہے۔ تم دیکھنا اگر میں اس سال ڈویژن کی ٹیم میں سلیکٹ ہو کر اچھا کھیل گیا تو مجھے کوئی نہ کوئی بنک یا دوسرا ادارہ ملازمت کی پیش کر دے گا اور پھر اگر میں ٹیسٹ میچ کھیل گیا تو میں اتنی دولت کما لوں گا کہ اپنا ذاتی کاروبار کر سکوں گا"۔ عمران اپنے خوابوں کو لفظوں کی زبان دیتا چلا گیا۔

مگر عمران یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تمھیں یہ سب کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ پھر میرے والدین تمہارے خوابوں کے لئے، جو ضروری نہیں کہ پورے بھی ہوں، مجھے زیادہ دن گھر تو نہیں بٹھا سکتے — تم خود سوچو — تمھیں معلوم ہے کہ میرے لئے کیسے کیسے رشتے آرہے ہیں لیکن ڈیڈی کی اولین پسند تم ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ تم ہر طرح سے ایک اچھے انسان ہو لیکن تم میں ایک خامی ہے کہ تم امید پر زندگی گذارنا چاہتے ہو۔ ڈیڈی بھی اور میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ تم مستقل مزاج بنو۔ تمھیں ابھی سے کچھ کرنا چاہیئے اگر کرکٹ ہی میں نام چاہتے ہو تو اتنے تیز ہو جاؤ کہ منزل خود تمہارے قریب ہو جائے"۔

"میں کوشش کروں گا"۔ عمران نے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔ اسی طرح کی چند باتوں کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

عمران اور نجمہ کی اس محبت کو ہر طرح کامیاب محبت کہا جا سکتا تھا۔ نجمہ ڈیڈی بھی نیم رضامند تھے جبکہ عمران کا اب کوئی نہ رہا تھا۔ ماں باپ آٹھ نو سال قبل ہی آگے پیچھے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ ایک بہن بھی تھی جو ان دنوں سے پہلے ہی ٹائیفائیڈ کا شکار ہو گئی تھی۔ ماموں، چچا وغیرہ ضرور تھے لیکن وہ دوسرے شہروں میں رہتے تھے

عمران ایک، مہذّب، بااخلاق، ملنسار اور شریف نوجوان تھا۔ اس کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے نجمہ کے والد سیٹھ اکرم الدین کو اپنی بیٹی کے انتخاب پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ ایک شفیق باپ تھے۔ انہوں نے جب عمران کی خوبیاں بھانپ لیں تو پھر خاموش ہی رہے ایسا نہ کیا کہ بیٹی کو کسی دولت مند سے بیاہنے کے خواب دیکھتے۔ انہیں معلوم تھا کہ دولت ہاتھ کا میل ہے۔ یہ خود پیدا کی جاتی ہے۔ انہوں نے خود ایک معمولی آدمی ہوتے ہوئے محنت کے بل بوتے پر یہ مقام پایا تھا۔ اسی لئے ان میں امارات کا ذرہ برابر بھی غرور نہ تھا۔ لیکن انہوں نے نجمہ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر درمیان میں اگر کوئی اور اچھا لڑکا نظر آگیا تو پھر اسے ان کی بات ماننا ہوگی۔ اسی لئے وہ عمران سے جلد از جلد مستقبل بہتر بنانے کی گفتگو کر رہی تھی۔

عمران کو پورا یقین تھا کہ وہ کرکٹ کے ذریعہ نام اور دام دونوں کمانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ اسکول کے زمانہ میں اچھے نمبر حاصل کرنے والا لڑکا تھا۔ لیکن کالج میں آنے کے بعد جب سے اسے کرکٹ کا شوق ہوا تھا تعلیم اس کے لئے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اور اب وہ کرکٹ ہی کو اپنا کیریئر بنا بیٹھا تھا۔

عمران یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ خبر ڈویژن کی کرکٹ ٹیم کے ٹرائلز کے متعلق تھی جو اگلے دو روز بعد منعقد ہونے والے تھے۔ عمران نے جب سے یہ خبر پڑھی تھی اس کی رگ رگ میں

پارہ سا بھر گیا۔ اس کے لئے دو دن گذارنے مشکل ہو گئے۔ دو دن بعد ہونے والے ٹرائلز پر اس کے کیریئر کا دارومدار تھا۔ دو دن بعد فیصلہ ہونا تھا کہ وہ ترقی کے زینے پر چڑھ سکے گا یا نیچے ہی کھڑا رہ جائے گا۔

لمحہ لمحہ گذارنے کے بعد ٹرائلز کا دن آ ہی گیا۔ وہ خدا سے دعا کر رہا تھا کہ یہاں صلاحیت کام آئے۔ کسی کی سفارش نہ چلے۔ اس نے ٹرائلز کمیٹی کے سامنے جا کر اپنے کرکٹ سرٹیفکیٹ اور اپنے کلب کے سیکریٹری کا تعارفی خط رکھ دیا۔ اس کا نام ٹرائلز دینے والے کھلاڑیوں میں لکھ لیا گیا عمران کو یہاں آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ٹیم تو بس پوری کی پوری سلیکٹ ہے بس دو بیٹسمین اور ایک فاسٹ باؤلر منتخب کیا جائے گا۔ عمران کے ساتھ ندیم بھی ٹرائلز دینے آیا تھا۔ کھیل کے بارے میں دونوں کے نظریات مختلف تھے۔ ندیم کھیل کو صرف کھیل ہی سمجھتا تھا۔ وہ بھی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی تین جوان بہنیں بھی تھیں جن کی عمریں شادی کے لئے رشتے کی آس میں بیتی جا رہی تھیں۔ ندیم ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا۔ کھیلنے کا تو اسے بھی بہت شوق تھا لیکن وہ کرکٹ کو کیریئر بنانے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا کہ عمران۔ ٹرائلز شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ دونوں نے بہت عمدہ اسٹروکس کھیلے۔ وہاں موجود تماشائیوں نے انہیں دل کھول کر داد دی۔ چند ایک نے تو ان کے منتخب ہونے کی پیشن گوئی بھی کر دی تھی۔

دوسرے دن کا اخبار دونوں کے لئے مسرتوں کا خزانہ لے کر آیا تھا کیونکہ وہ دونوں ہی سلیکٹ کر لئے گئے تھے ۔۔

ٹورنامنٹ شروع ہوئے۔ اپنے ڈویژن کے ڈھیر لگا دیئے اور ڈویژن کی ٹیم جو کہ گذشتہ سیزن میں آخری نمبروں پر تھی اس دفعہ دوسری پوزیشن پر آ گئی۔ اس کامیابی میں بڑا حصہ ندیم اور عمران کا تھا دونوں نے کئی سنچریاں اور نصف سنچریاں بنا کر اپنے انتخاب کو درست ثابت کر دیا تھا۔ اس سیزن میں ان کی یہ کارکردگی دیکھ کر ندیم کو قومی ایئر لائنز نے اور عمران کو ایک بنک نے ملازمت کی پیشکش کر دی اور یوں عمران کامیابی کی پہلی منزل طے کر گیا اور کھیل کی بدولت بنک میں ملازم ہو گیا۔ دوسری طرف ندیم نے بھی قومی ایئر لائنز کو جوائن کر لیا۔

ادھر نجمہ کا اصرار بہت بڑھ گیا تھا اس کا کہنا تھا کہ ڈیڈی اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ عمران نے اس کو بتایا کہ قومی کرکٹ ٹیم کے ٹرائل میچ ہونے والا ہے جو کھلاڑی زیادہ اسکور کرے گا وہ قومی ٹیم میں جگہ پائے گا۔ قومی اخبار اس میں ندیم میں سے کسی ایک کے لئے جانے پر مضامین لکھ رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ قومی ٹیم کے لئے منتخب کر لیا جائے گا۔ اللہ اللہ ٹرائل میچ کا دن آیا۔ یہ میچ مقامی اسٹیڈیم میں کھیلا جا رہا تھا۔ جس ٹیم کی طرف سے عمران اور ندیم کھیل رہے تھے اس کو صدر مملکت کے نام سے منسوب کیا گیا تھا جبکہ مخالف ٹیم ملک کی قومی ٹیم تھی اب یہ عمران کی صلاحیتوں پر منحصر تھا کہ وہ قومی ٹیم میں جگہ بنا لے یا ایک طویل انتظار کرے۔ کیونکہ قومی ٹیم کے پاس کھلاڑیوں کی کمی نہ تھی۔ اس میچ کے ذریعہ صرف ایک کھلاڑی لیا جانا تھا کیونکہ قومی ٹیم کا ایک بیٹسمین آؤٹ آف فارم تھا عمران اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر کم از کم تین اس کے ٹیسٹ کھیلنے کا کوئی چانس نہیں اور اگر عمران ٹیسٹ نہیں کھیل سکا تو یقیناً نجمہ کے والد انتظار نہ کر سکیں گے اور اس کی نجمہ کسی اور کی ہو جائے گی۔

یہ میچ محض ایک میچ نہیں تھا اس پر عمران کے کیریئر کا انحصار تھا۔ میچ سے ایک دن قبل عمران کی ملاقات ندیم سے ہوئی۔

"ندیم! یہ میچ میرے کیریئر پر کتنا اثر انداز ہو گا اگر

میں قومی ٹیم میں جگہ پا گیا تو میں محبت اور دولت دونوں کو حاصل کر لوں گا لیکن اگر ناکام رہا تو ......" اس کے آگے اسے یارائے گفتگو نہ رہا۔

"ہاں عمران! تم ٹھیک کہتے ہو، یہ میچ میرے لئے بھی بہت اہم ہے کیونکہ ہماری قومی ایئر لائنز کے اسپورٹس آفیسر نے کہا ہے کہ اگر میں قومی ٹیم میں جگہ پا گیا تو مجھے کلرک سے ترقی دے کر ایک افسر بنا دیا جائے گا۔ مجھے کار بھی مل جائے گی اور بنگلہ بھی، اور ..... اور .....،" اور بات اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ مگر عمران جانتا تھا کہ ندیم کی تین جوان بہنیں ہیں جن کی شادی اب ہو جانا چاہیئے۔ بہنوں کی شادی میں اگر تاخیر ہو تو جو کچھ بھائی کے دل پر گذرتی ہے، اسے عمران اچھی طرح جانتا تھا۔

میچ شروع ہوا۔ عمران کی ٹیم نے ٹاس جیت کر پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک روزہ میچ تھا۔ میچ کے شروع میں ہی پہلی وکٹ صفر پر گر گئی اب عمران کھیلنے آیا ابھی عمران نے اپنے اسکور کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ سامنے والا کھلاڑی صرف دو رنز بنا کر آؤٹ ہو گیا۔ اب ندیم کھیلنے آیا۔ ندیم نے آتے ہی آف اسٹمپ پر پڑنے والی ایک گیند کو کور کی جانب کھیلا اور رنز لینے کے لئے کافی آگے چلا گیا۔ دوسری جانب عمران نے ندیم کو اپنی طرف آتا دیکھا تو بہت حیران ہوا کیونکہ یہ کسی بھی طرح رن نہیں تھا۔ لیکن ندیم آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب اگر ندیم واپس جاتا تب بھی آؤٹ ہو جاتا کیونکہ فیلڈر تھرو کرنے ہی والا تھا اور اب ندیم کے لئے واپس پلٹنا ناممکن تھا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں عمران نے ایک فیصلہ کر لیا اور یس کہتے ہوئے کریز سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ کسی بھی طرح دوسری کریز میں نہیں پہنچ پائے گا اور صفر پر آؤٹ ہو جائیگا اور پھر اس کا کیریئر کم از کم تین سال تک جوں کا توں رہ جا جائے گا اور اس کی محبت بھی دم توڑ دے گی۔ نجمہ کے والدین سال تک اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ انہوں نے تو اسے آخری چانس دیا تھا۔ اس نے لمحے بھر میں یہ سب سوچ کر آؤٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ندیم کو آؤٹ ہونے سے بچا لیا "اب وہ رنز کرے گا اور قومی ٹیم میں سلیکٹ ہو جائیگا اور وہ ترقی کرے گا اور اس کی بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ آخر ندیم کی بہنیں بھی تو ہیں،" وہ اپنی سوچوں میں غرق تھا کہ ساتھ ہی کھڑے ہوئے فیلڈر نے کہا۔ "عمران صاحب! آپ آؤٹ ہو چکے ہیں۔" اس کی آواز سن کر یکایک عمران کو ہوش آیا اور وہ آہستہ آہستہ پویلین کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے چلتے چلتے ندیم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، ممنونیت کے آنسو۔ عمران پویلین کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "اپنے گھر سے زیادہ بہنوں کا گھر بسنا ضروری ہے۔"

وہ پویلین میں آ کر رکا نہیں، اسٹیڈیم سے باہر نکل آیا۔

ندیم ٹیم میں سلیکٹ ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد وہ ٹیم کے ساتھ انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ عمران نے خود کو نجمہ سے دور کر لیا۔ اب وہ کیا منہ لے کر اس کے سامنے جاتا۔ نجمہ نے خود ہی اس کو ڈھونڈ لیا۔ وہ اپنے گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ نجمہ آ گئی۔

"کیا بات ہے عمران! تم نے ملنا کیوں چھوڑ دیا؟" اس نے شکوہ کیا۔

"کس منہ سے تمہارا سامنا کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اب تم میری نہیں بن سکتیں۔" عمران نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ دل پر رکھے ہوئے پتھر کا بوجھ لہجہ بھی نہیں سہار

پار رہا تھا۔

"لیکن میں تمہیں ایک خوشخبری دینے آئی ہوں۔ اگلے جمعہ کو میری شادی ہے۔ یہ لو اپنا کارڈ" اور اس نے اس کی جانب ایک کارڈ بڑھا دیا۔

عمران نے کارڈ لے لیا لیکن کھول کر نہیں دیکھا۔

"یہ تو دیکھ لو میری شادی کس سے ہو رہی ہے" نجمہ کی آنکھوں میں شوخی نمایاں تھی۔

عمران نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔

نجمہ کا اصرار بڑھا تو عمران نے اس کا دل رکھنے کے لئے کارڈ کھول ڈالا۔ کارڈ پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل پڑا۔ نجمہ کی شادی اس کے ساتھ ہو رہی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ نجمہ!" عمران نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

میچ ختم ہونے کے بعد ندیم صاحب ہمارے گھر آئے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی سے کافی دیر تک بات چیت کی۔ جس کے بعد ڈیڈی نے یہ کارڈ چھپوانے کا آرڈر دے دیا"، نجمہ کو بھی جیسے سب کچھ بیان کرنے کے موقع کی تلاش تھی اور ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔

"اور ہاں ندیم صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ عمران سے کہنا کہ وہ اگلا سیزن قومی ائیر لائنز کی جانب سے کھیلے گا۔ قومی ائیر لائنز نے اسے اپنے یہاں ملازمت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کلرک کی حیثیت سے نہیں افسر کی حیثیت سے"

لیکن عمران یہ سب کہاں سن رہا تھا۔ اس کا دماغ تو آسمان پر پرواز کر رہا تھا۔ اس کی قربانی کو رحمتوں کے نرم سائے مل گئے تھے۔

بقیہ "سچے رشتے"

کر اس نے سب کے بستے دیکھنے شروع کر دیے۔ اگر کوئی آیا ہوتا تو کسی کا بستہ ملتا۔ آخر اس نے ندیم کی بینچ کو بھی دیکھا تو وہاں ندیم کا بستہ رکھا ہوا تھا۔ عامر کے منہ سے فوراً نکلا "ندیم تم عظیم ہو" پھر اس نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا کہ تم نے تو ندیم کو برا سمجھا لیکن اسی ندیم نے تمہارا کتنا خیال رکھا۔ اتنا سوچ کر عامر پشیمانی کے ساتھ بوجھل قدموں سے کلاس سے باہر نکل گیا۔ اب اس کی اور ندیم کی ملاقات میں ذرا ہی دیر باقی تھی۔

ماں کی بددعاؤں سے ڈرو خصوصاً جب وہ ہاتھ اٹھا کر حضورِ خداوندی میں بددعا کرے (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جان لے کہ میرا دلِ ایمان سے خالی ہے۔ ——— (حضرت ابو بکرؓ) ———

دشمن کو مہربانی اور احسان سے جیتو اور دوست کو نیک سلوک سے۔ ——— (حضرت داتا گنج بخشؒ) ———

انشائیے اور رپورتاژ

جوتا

از: پروفیسر محمد حفیظ قریشی
گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد

کہتے ہیں، ایک رئیس کا درزی سلائی کے بعد بچ رہنے والا کپڑا خاصی مقدار میں کھا جاتا تھا۔ اس بات کا علم جب رئیس کو ہوا تو اُس نے درزی سے کہا کہ وہ کپڑا سینے کیلئے اپنے گھر نہ لے جائے۔ بلکہ رئیس کی کوٹھی کی بیٹھک میں ہی آ کر سی دے۔ خالی ہاتھ آئے اور خالی ہاتھ چلا جائے۔ درزی بھی اس بات پر رضامند ہوگیا۔ کیونکہ رئیس پرانا اور بڑا گاہک تھا مگر اپنے لڑکے کو ہدایت کی کہ دوپہر میں آ کر بیٹھک کے باہر گلی میں کھڑا ہو جائے۔ لڑکا آ گیا اور درزی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے اُس نے چلا کر کہا "ابا آپ کو امی بلا رہی ہیں" درزی نے ظاہری طیش میں آ کر جواب دیا "نظر نہیں آتا؟ میں کام کر رہا ہوں۔" لڑکے نے وہی جملہ مکرر ادا کیا تو درزی نے اُس پر زور سے اپنا جوتا پھینک مارا۔ لڑکے نے نظر اُٹھا کر جوتا اُٹھایا اور پھر وہیں ڈال کر اپنے گھر چلا گیا۔ درزی بڑبڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور گلی میں سے جوتا واپس اُٹھا لایا۔ رئیس بڑا خوش ہوا کہ دیکھو میرے کام کو توجہ سے کرنے کا درزی کو کتنا شوق ہے کہ بیوی کے بلانے پر بھی ناراض ہوگیا۔ کپڑے سل گئے۔ درزی معاوضہ لے کر چلا گیا۔ رئیس نے حساب لگایا تو پتہ چلا کہ کپڑا تو درزی نے پہلے سے بھی کہیں زیادہ بچا کر کھایا ہے۔ بات سمجھ میں نہ آئی تو درزی سے ہی جا کر پوچھا کہ بھائی یہ تو بتاؤ کہ تم آئے بھی خالی ہاتھ اور گئے بھی خالی ہاتھ تو پھر بچا ہوا کپڑا کہاں اور کیسے چلا گیا؟ درزی نے کہا "اب آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے لڑکے پر جوتا پھینک مارا تھا۔ بس اُسی میں بچا ہوا کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اُسے لڑکا نکال کر لے گیا اور خالی جوتا چھوڑ گیا۔"

اس قصہ سے ثابت ہوا کہ جوتا بڑے کام کی چیز ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو جوتے کے بے شمار فوائد ہیں۔ گرمی میں تیز دھوپ سے تپتے ہوئے فرش، میدان اور راستے پر چلنے والے کے پیر جھلس جائیں اگر وہ جوتا نہ پہنے، کیچڑ، کانٹوں، کنکریٹ، شیشے اور دھاتوں کے تیز دھار باریک اور چھوٹے موٹے ٹکڑوں سے پاؤں کو زخمی ہونے سے جوتا ہی بچاتا ہے۔ تعمیرات میں معروف مزدور سیمنٹ اور چونے کی کاٹ سے ربڑ کے جوتے پہن کر محفوظ رہتے ہیں۔ سردی کی یخ بستہ ہواؤں کی خون جما دینے والی ٹھنڈک سے بھی جوتا ہی انسان کے پیروں کو پناہ دیتا ہے۔ جوتا پہن کر باورچی شادیوں اور دیگر تقریبات میں پکائی جانے والی دیگوں کے نیچے کی بھری ہوئی آگ کے انگاروں پر بے دھڑک ادھر سے اُدھر متحرک رہتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کے بھی دیہاتی اور کچے علاقوں کی جھاڑیوں، گھاس اور ناہموار برہنہ زمین پر موجود زہریلے اور گزند پہنچانے

والے کیڑے مکوڑوں اور حشرات الارض سے امان بھی انسان کو جوتے ہی کی مدد سے ملتی ہے۔ جوتا ہنگامی صورتحال میں نہتے آدمی کے ہاتھ میں ہتھیار بن جاتا ہے۔ جوتا بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مختلف کھیل کھیلنے میں انسان کو بے شمار تکالیف سے بچا لیتا ہے۔ دوڑوں کے مختلف فاصلوں کے مقابلے جوتے پہن کر کیے جاتے ہیں۔ ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے لیے بڑے اہتمام سے کھلاڑیوں کے جوتے بنائے جاتے ہیں، تاکہ ٹھوکر لگ کر پاؤں کی انگلیاں، انگوٹھے یا تلوے زخمی نہ ہونے پائیں۔ اسکائی انگ اور اسکیٹنگ کے جوتے مخصوص بناوٹ اور عجیب شکل کے ہوتے ہیں جو کھلاڑی کو برف پر تیزی سے پھسلنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ جوتا پاؤں کی رگوں اور پٹھوں کو غیر ضروری طور پر کھنچ جانے سے بچاتا ہے۔ لمبے اور بھاری جوتے فوجی سپاہیوں کے اعتماد اور "استقامت" میں اضافہ کرتے ہیں۔ نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی عید پر جوتے پہن کر ہی عید کی صحیح خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ وہ شخص احساسِ کمتری کا شکار نظر آتا ہے جو عید کے موقعہ پر نیا جوتا نہ خریدے یا نہ خرید سکے۔

جوتا شان و شوکت اور نخر و غرور کا مظہر بھی ہے اور مختلف عہدوں اور مناصب پر فائز افراد اپنے عہدے کی مناسبت سے جوتے پہنتے ہیں اور اُن کی دیکھ بھال اور چمک دمک کو بڑے احتیاط و توجہ سے برقرار رکھتے ہیں۔ وہ آفیسر لوگوں کو سُست نظر آتا ہے جس کے جوتوں پر پالش نہ ہوئی ہو۔ قبیلے کے سردار کا جوتا بھی طرہ دار ہوتا ہے۔

بادشاہوں اور ملکاؤں کے جوتوں میں ہیرے، موتی، لعل و جواہر، مخمل اور دیگر اعلیٰ ترین دستیاب کپڑے کی زمین پر جڑے جاتے تھے۔ آج بھی دلہن کی جوتیاں سُرخ اور چمک دار ہوتی ہیں۔ سندھ کے آخری کلہوڑہ حکمران میاں عبدالنبی عباسی کلہوڑو کی ملکہ کے ایک پاؤں کی جوتی سات لاکھ روپے کی تھی، جبکہ دوسرے پاؤں کی ایسی ہی ایک جوتی سندھ چھوڑتے وقت دریائے سندھ پار کر کے کشتی سے اُترنے کے موقعہ پر دریا کے مشرقی کنارے کی کیچڑ میں پھنس کر گم ہوگئی تھی۔

جس مہمان سے میزبان کو حد درجہ محبت ہوتی ہے اُس سے گھر کے کسی بھی مقام پر جوتا نہیں اُتروایا جاتا۔ دولہا اپنے گھوڑے یا کار سے لے کر سسرال کے قالین تک پر جوتا پہنے پھرتا اور بیٹھتا ہے۔ بلکہ چند ایک رسموں کی ادائیگی میں تو قیمتی گدّوں پر بھی جوتوں سمیت ہی چارپائی بیٹھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سسرال والے رخصتی سے قبل دولہا کا جوتا چرانے یا چھین لینے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہو کر بغیر موٹی رقم وصول کیے واپس نہیں دیتے۔ یہ بات بھی ہے کہ وہ جوتا سسرال والوں نے ہی دولہا کو بھجوایا ہوتا ہے تاکہ وہ دولہا بننے کے وقت اُسے پہنے

یہ بات البتہ بڑی عجیب ہے کہ جوتے کے اتنے عظیم فوائد کے باوجود ہندوستان میں صدیوں سے عورت جوتا پہن نہیں سکتی تھی۔ یعنی اُسے یہ حق نہ تھا کہ وہ کسی بھی حال میں کہیں بھی، کسی کے سامنے یا تنہائی میں جوتا پہنتی۔ ہندوستان کے غیر مسلم معاشرے میں عورت کو ہمیشہ مرد کی جوتی ہی سمجھا گیا ہے اور اُسے عزت نہ دی گئی۔ اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر، مار پیٹ کر، طعن و تشنیع کا نشانہ بنا کر رکھا گیا۔ وراثت میں حصّہ دار نہ بنایا گیا اور خاوند کی موت پر اُسکی چتا میں جلا کر عورت کو ستی بھی بنایا گیا۔ بہرحال اِس ظالمانہ رسم کو انگریزوں نے بزور قانون روک دیا۔ عورتوں کے علاوہ ہندوستان کی نیچ ذاتوں کے مرد بھی جوتا پہننے کی گستاخی نہیں کر سکتے۔ وسطی ہندوستان کی ایک قوم تو اسی جو "تنگ پیری" کہلاتی ہے۔

جوتا مفید اس حد تک بھی ہے کہ مرگی نام کی ایک مرض میں عارضی علاج اور افاقہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بیہ...

نے اپنے شہر حیدرآباد کے مارکیٹ ٹاور کے چوک میں ذاتی طور پر ایک دفعہ مشاہدہ کیا کہ ایک شخص سرِ راہ مرگی کا دورہ پڑنے سے گر پڑا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے اور افسوس کے ساتھ اُسے دیکھ رہے تھے۔ کسی تجربہ کار بزرگ نے بھی دیکھا۔ اُنہوں نے پہلی فرصت میں اپنے پیر سے جوتا اُتارا اور زمین پر تین دفعہ زور سے مارا اور تلوے کے رُخ سے اُس مرگی زدہ کی ناک پر رکھ کر سونگھایا۔ چند ہی لمحوں میں وہ شخص ہوش میں آ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

سُنا ہے جوتے میں بڑی کرامت بھی ہے۔ پڑھائی سے بھاگنے والے طالبِ علم کو جوتا کتاب کی طرف کھینچ لاتا ہے اور سبق بھی یاد کروا دیتا ہے۔ نافرمان اور بے راہ رو بیٹے کو ابّا کا جوتا سیدھی راہ پر لے آتا ہے۔ چند روز لگن سے جوتے گھِسنے سے بیٹے کے لیے بہو مل جایا کرتی تھی اور بے روزگار کو ملازمت مِل جاتی تھی۔

جوتے پر محاورے بھی بہت ہیں۔ جوتیوں میں دال بٹنا، یعنی اپنوں یا یگانوں کے مابین اختلافات کا بدنامی اور جھگڑے کی حد تک بڑھ جانا۔ جوتیاں چلنا۔ یعنی کسی معاملے پر بحث کی نوبت ہاتھا پائی تک آ جانا۔ جوتیاں مارنا یعنی کسی کو باتوں باتوں میں زچ یا شرمندہ کرنے کے لیے طنز کرنا۔ عورتیں ناراض ہو کر کسی کام کو کرنے سے نخریہ انکار کریں گی تو یوں کہیں گی۔ "جلائے میری جوتی" [illegible] بوتی! اگر کسی لاپرواہی یا لاتعلقی کا ناراضگی کے ساتھ اظہار کرنا مقصود ہوگا تو کوئی خاتون کہے گی "میری جوتی سے"۔ کسی بچے کو کسی کام سے باز رکھنے کے لیے بڑے کہتے ہیں "اتنے جوتے ماروں گا کہ سر کے بال اُڑ جائیں گے۔"

جوتے کا بڑوں کی عزت بڑھانے سے بھی بڑا تعلق ہے اُستادوں کی جوتیاں برسوں سیدھی کی جاتی ہیں تاکہ وہ خوش ہو کر شاگرد کو علم و ہنر کے پیچ سمجھا دیں۔ اگر کوئی بزرگ کسی چھوٹے کو اُس کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہے تو وہ چھوٹا جواباً احترام سے یوں کہتا ہے "یہ سب آپ کی جوتیوں کے صدقے ہی سے ملا ہے۔ قصوروار شخص سعادت مندی سے اپنے بڑوں سے کہتا ہے "اگر میرا قصور ہو تو آپ میرے دو جوتے مار لیں"۔

کچھ لوگ بلکہ کبھی کبھی بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جوتے کو اتنے بہت سارے فوائد کا حامل جانتے ہوئے بھی اُسے چھوڑ بھاگتے ہیں۔ کسی سیاسی جلسۂ عام میں مخالفین کی مداخلت بے کے بعد بھگدڑ مچ جاتی ہے تو حاضرینِ جلسہ جان کی خیر مناتے ہوئے جوتے چھوڑ سر پر پیر رکھ کر بھاگ اُٹھتے ہیں اور جلسے کے درہم برہم ہونے کے بعد جلسہ گاہ میں جوتے ہی جوتے بکھرے نظر آتے ہیں۔ یوں کبھی کبھی ایسے واقعے کے بعد بہت سے غریبوں اور ناداروں (HAVE - NOTS) کا بھلا ہو جاتا ہے۔ کسی گھمنڈ میں مبتلا ملک کی حملہ آور فوج شکست کھا کر بھاگتے وقت بھاری اور ہلکے اسلحے کے علاوہ جوتے بھی چھوڑ بھاگتی ہے۔ جن کو فاتح اور دافع قوم کے عوام سمیٹ کر فخریہ نمائش کرتے ہیں۔

جوتا تفریحِ طبع کا بھی ذریعہ ہوتا ہے۔ کوئی صاحب نیا جوتا پہن کر دوستوں کے بیچ آئیں تو دوست اُس جوتے کی ہر پہلو سے تعریف کرنے کے بعد یہ ضرور دریافت کرتے ہیں "اچھا تو یہ جوتا آپ کو کتنے میں پڑا؟!"

جوتے بہت سی جگہوں پر دستیاب ہوتے ہیں۔ جوتے کارخانے سے خریدے جا سکتے ہیں۔ کسی قانع اور گوشہ نشین ماہر موچی کو آرڈر دے کر اُسکی مہارت کی داد دینے کیلئے بنوائے جا سکتے ہیں۔ شاندار شوکیسوں قالینوں اور ایئر کنڈیشنرز سے مزیّن انگریزی ناموں سے موسوم اونچی دوکانوں سے پھیکے پکوان کی طرح گتّے کے جوتے چمڑے کے سمجھ کر چوگنی قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی مسلّمہ حقیقت ہے کہ آج کے دور میں جوتا خریدنا اکثریت کے بس کی بات نہیں۔

اس لیے غریب قوموں کے چھوٹے جوتے فٹ پاتھ سے سستے داموں خریدے جاتے ہیں۔ جیب میں پیسے نہ ہوں تو مسجد سے نمازِ باجماعت کے وقت یا کسی درگاہ یا مزار کے دروازے پر عرس کے موقع پر پار بھی کیے جا سکتے ہیں۔ مسجد کے دروازے پر پرانے کے نئے جوتے بلامعاوضہ "بدلی کرنے" کا تجربہ بھی کیا جا سکتا ہے کھلا بپرانی گلاس والے سے دیسی مرمت شدہ پرانے جوتے بھی سستے داموں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مزارات کے زائرین کے جوتوں کی رکھوالی کر کے کوئی بے روزگار اور مجبور شخص اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھی پالتا ہے۔

جوتوں کے ڈیزائن صدیوں سے بڑے متنوع بنتے رہے ہیں۔ جن کا بیان ایک الگ مضمون کا طالب ہوگا البتہ جوتوں کے سائز کا ذکر یہاں مختصراً کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں ایک عالمی سطح کی جفت ساز کمپنی کے سائز معیاری تسلیم کیے جا چکے ہیں جو یہ سائز نمبروں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً بچکانہ نمبر ۱۱، ۵، مردانہ آٹھ یا نو نمبر وغیرہ۔ البتہ ایک سائز نایاب ہے۔ جس کے لیے اسکا پہننے والا شخص دنیا کا طویل ترین انسان سیہون کا باشندہ عالم خان جوتا خصوصی آرڈر دے کر تیار کروانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اپنے شاہی بازار کی ایک دوکان کے شوکیس میں گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے "دیو سائز" جوتا رکھا ہوا ہے۔ جو بلا مبالغہ تین فٹ لمبا اور ایک فٹ اُونچا تو ہوگا ہی۔ دنیا میں سب سے چھوٹے سائز کا جوتا چینی خواتین کو درکار ہوتا ہے۔

جوتا دنیا میں اتنا زیادہ استعمال ہوتا ہے کہ ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی میں سے ایک ہے۔ اور تعیشات میں سے بھی۔ حالانکہ اسکا ذکر ضروری اہمیت رکھتے ہوئے بھی معاشیات کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ کچھ لوگ سال میں ایک بار جوتے کی نئی جوڑی خریدتے ہیں، پہنتے ہیں۔ گھستے ہیں پھاڑتے ہیں۔ مرمت کرواتے ہیں۔ چلاتے رہتے ہیں۔ کئی ایسے بھی ہیں کہ بیسیوں جوڑیاں جوتوں کی ہر وقت الماری میں گھر میں موجود رکھتے ہیں۔ اور گھر سے باہر نکلنے سے پہلے اُن کے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی جوڑی جوتے کی پہن کر جانے کے لیے منتخب کی جائے۔

جوتے جیسی ناگزیر اور اہم ضرورتِ زندگی چیز کی ابتداء اور ایجاد کے بارے میں ضروری تحقیق ہونا میرے خیال میں ابھی باقی ہے۔ کس ملک کے کس شہر یا گاؤں میں یا قبیلے یا برادری میں کس شخص نے سب سے پہلے جوتا بنا کر کب اور کیوں پہنا؟ یہ سوال ہے جس پر ابھی میرا قلم چلتا۔ مگر اسی سوال پر دعوتِ فکر دیتا ہوا ایک اہم نکتے کی طرف مڑ جاؤں گا۔

وہ نکتہ بڑا اہم ہے۔ یعنی یہ کہ تعلیم حاصل کرنے پر اپنی تمام تر توجہ نہ دینے والے طلبہ مستقبل کی زندگی کے نہ ختم ہونے والے مصائب کے جوتے آخر دم تک کھاتے رہتے ہیں اور پچھتاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح منتشر اور باہم دستِ بگریباں افراد کی قوم متحد اور باہم شیر و شکر افراد کی قوم کے جوتے کھا کر ہی رہتی ہے۔

اپنے بنیادی عقائد، اساسی نظریئے۔ قومی سلامتی اور اتحادِ ملّی کے لیے جوش و جذبے کا کام کرنے والی متحد اور مضبوط قوم کے جوتے دوسری اقوام بخوشی اپنے سر پر اٹھاتی ہیں۔

کھُلی اور سچّی حقیقت

میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے، اور یہ بالکل کھلی اور سچی حقیقت ہے کہ اگر کوئی خوبی پیدا ہو سکتی ہے تو اس سے ہو سکتی ہے۔

(پروفیسر کارلائل)

محاورے میری زبان میں

طاہر انور بھٹہ
فرسٹ ایئر بائیولوجی

کل رات جب کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا تو میرے دل نے کہا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیا بیٹھے ہو، کچھ کام کرو جس سے تمہارا نام بھی بنے اور عزت بھی ملے۔ خیر صاحب خیال کیا چلو کالج میگزین کے لئے کچھ لکھ دیں۔ عزت تو عزت اپنی شہرت کو بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ چنانچہ میں نے سوچا کیوں نہ ایسی بے پر کی اڑائی جائے جس کے ہر جملے میں محاورہ یا ضرب الامثال موجود ہو۔ چنانچہ کیل کانٹے سے مسلح ہو کر میں لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر کمبخت نیند نے جلد ہی آلیا اس نیند کا کیا کریں یہ تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ ابھی ہم اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر ہی نہ کر پائے تھے کہ نیند نے اپنا جال مزید پھیلا دیا۔ جس کی لپیٹ میں آ کر ہم جلد ہی خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو سورج سوا نیزے پر آ چکا تھا اور ادھر پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اچانک ایک چیز پر نظر پڑی تو منہ میں پانی بھر آیا۔ جلدی سے اٹھایا اور چٹ کر لیا۔ مگر بھوک کہاں مٹنے والی تھی یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی۔ سچ ہے دام بنائے کام میں بھی اپنی جیب میں پیسے لے کر ہوٹل کو سدھارا۔ لیکن راہ میں ہی وسیم مل گیا تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مقصود بھی آ دھمکا۔ ان دونوں میں کچھ بنتی نہیں تھی۔ خیر باتوں ہی باتوں میں ان دونوں میں تو تو میں میں ہو گئی۔ مقصود نے جو وسیم کو گالی بکی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے مقصود کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ مجھ سے تین پانچ مت کرو میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں ایسا ہاتھ دکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

میں نے ان دونوں کو کافی سمجھایا لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ انہوں نے میری باتیں ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے نکال دیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر تلے ہوئے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی اور میں اس خیال سے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی نہ پس جائیں الگ کھڑا ہو گیا۔

آخر کب تک میں صبر کرتا۔ میں بھی آستین چڑھا کر ان دونوں کے بیچ کود گیا اور بمشکل ان دونوں کو علیحدہ کیا اور ان دونوں کو خوب سنائیں اور کہا کہ میں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا عادی ہوں۔ لہٰذا عقل کے ناخن لو اور فوراً نو دو گیارہ ہو جاؤ اور آئندہ کسی کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ان سے نمٹ کر چلا ہی تھا کہ سامنے سے لنگوٹیا یار رومال ہاتھ میں لئے آتا ہوا دکھائی دیا۔ دل نے کہا "یار بہتی گنگا ہے ہاتھ دھو لو۔ مگر وہ بھی ایسا بخیل تھا کہ چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے۔ صاف کنی کترا کر نکل گیا۔

ہوٹل جب پہنچا تو کھانے کی خوشبو سونگھ کر منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ جب میرے کہنے کے مطابق بیرے نے میرے سامنے

کھانا لا کر رکھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ابھی مشکل سے دو چار نوالے ہی حلق سے اتار رہے تھے کہ دوست آ گئے۔ انہیں دیکھ کر تو میری جان نکل گئی۔ کیا کرتا نہ کرتا ان کو بھی دعوت دینی پڑی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی سے اسی تاک میں تھے، ایک ہی حملے میں کھانے کا صفایا کر کے منہ پونچھتے ہوئے یہ جا وہ جا۔ خیر مجھے دل سے وہاں سے نکلا اور تیر کی طرح سیدھا گھر پہنچا تو عجیب ہی ماجرا تھا گھر والے کراچی سے آ چکے تھے اور گھر کے باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کیونکہ گھر کی چابی میرے پاس تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھٹ پڑے، اور ایسی درگت بنائی کہ میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا خیر اپنے کمرے میں جا کر دھڑام سے بستر پر جا گرا۔ آنتیں اب بھی قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ خیر تھوڑے بہت خیالی پلاؤ پکانے کے بعد میں جلد ہی خوابوں کی دنیا میں کھو گیا اور ایسا گھوڑے بیچ کر سویا کہ شام سات بجے آنکھ کھلی۔

اور یوں اس طرح میری محاوروں کی بیل مکمل ہو گئی۔

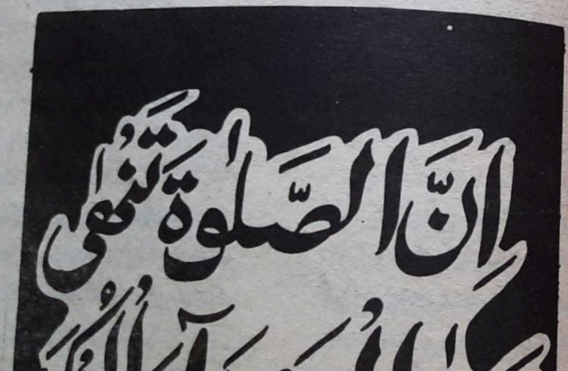

محمد طارق غوث فرسٹ ایئر میتھس

کالج اور ہم

سید محمد عارف
بی ایس سی سال اوّل

سنتے ہیں گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ اور ہماری جو شامت آئی تو والدین اور اُستادوں کے مشترکہ ڈنڈوں کے زیرِ سایہ میٹرک پاس کرلیا، خدانخواستہ ہمارا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہے کہ نوجوانوں کو میٹرک پاس کرنے سے باز رکھا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ محاوراتی زبان میں یہ تھا کہ "جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیا گھبرانا" یعنی اگر میٹرک پاس کر ہی لیا ہے تو کالج کے داخلے اور وہاں آنے جانے کی مشکلات بھی برداشت کرنی ہوں گی۔ پہلے ہی مرحلے یعنی داخلہ فارم حاصل کرنے کے چکر میں ہماری نئی قمیض کا یہ حشر ہوا کہ اچانک ہمارا شجرہ نسب جناب قیس سے جاملا، کیونکہ اُوپر کے تین ٹوٹے ہوئے بٹن ہمیں چاکِ گریباں بنا گئے۔ بعد میں باقی بٹن ہم نے خود توڑ لیے۔ کیونکہ ہمیں چاکِ گریباں کی نسبت چاکِ داماں ہونا زیادہ پسند تھا۔ اس صورت میں شاید ہمارا تعلق مرزا غالب سے جاملتا۔ ویسے بھی وہ ہمارے پسندیدہ شاعر ہیں خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا جو جملہ کی حدود تجاوز کرچکا تھا۔ لیکن اب بھی، سے ہم جملہ ہی کہیں گے۔ کیونکہ تجاوزات کے بارے میں ہم خاصے فراخ دل ہیں۔ ویسے ہمیں اپنی قمیض کا اتنا افسوس بھی نہیں کہ اگر وہ نہ ٹوٹتی میرا مقصد ہے پھٹتی تو ہماری وہ روایات ٹوٹ جاتیں جو بہ حیثیت قوم ہماری عادت ہے کہ پرانی چیزیں وقت کے ساتھ ساتھ قیمتی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ان کی حفاظت کی جائے۔ اسی لیے ہم نے اپنے قائد کے قول Unity, Faith, Discipline کو بھی فریم کرواکر دیوار پر اونچی جگہ لگا دیا ہے تاکہ نہ استعمال ہو نہ ٹوٹے، ارے پھر جملہ معترضہ آگیا خیر اگر داخلہ فارم لینے کیلئے دو جملہ معترضہ بھی ساتھ آجائیں تو کوئی معترض بات نہیں ہے۔ بہرحال فارم ملا اور ہم سمجھے کہ سب بلائیں تمام ہوئیں۔ مگر ہمیں پتہ نہ تھا کہ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ یعنی فارم واپس بھی جمع کرانا ہے۔ بہرحال صاحب فارم جمع کرایا نہ صرف فارم جمع کرایا بلکہ بارسوخ لوگوں کے تقریباً ۳ کلو خطوط بھی (خطوط کی مقدار وزن میں اسلیئے لکھی ہے کہ اگر گننے بیٹھ جاتے تو بلامبالغہ فارم جمع کرانے کی تاریخ گذر جاتی)۔ قصہ مختصر داخلہ ملا اور اس صورت ملا کہ ہم چاہتے تھے انجینئر بن کر تعمیراتی کمپنیوں کو بتائیں کہ بھئی کم از کم اپنے حصے کے سجدے تو عمارتوں سے نہ کروائیں۔ کیونکہ ہمارے خیال میں آئے دن سربسجود ہونے والی عمارتوں کو اس سے فائدہ پہونچتا۔ لیکن قسمت میں ملک و قوم کی خدمت کرنا نہ تھا۔ یعنی پری میڈیکل گروپ بہرحال کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے کہ کچھ ہو کے اصول کو Some thing better then nothing اپناتے ہوئے ہم نے بائیولوجی کو مجبوراً قبول کیا اور بقول حالی "جی چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں" خیر دُعا میں اثر تو پہلے بھی نہیں تھا۔ مگر نہ چاہتے ہوئے بائیولوجی قبول کی تو رزلٹ میں بھی اثر نہ ہوا اور ہم B.Sc میں پہونچ گئے۔ ویسے یہاں بھی ہم نہ چاہتے ہوئے ہی پہونچے ہیں اور اب منتظر ہیں کہ ہمارا یہ نہ چاہنا کیا گل کھلاتا ہے۔ خیر ہم بات کر رہے تھے کالج میں داخلے کی جو ہو بھی گیا اور وہ دن بھی آگیا جب ہماری کلاسیں شروع ہوگئیں اور بڑی تیاریوں کے بعد وہ وقت بھی آگیا جب ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی آپ کا کمربند لٹک رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اک سیکنڈ میں ہمارے ہاتھ کمربند کی جانب بڑھے تاکہ اسکو اس گستاخی کی سزا دی جائے مگر وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا یعنی ہم اپنے انکل کی لندن سے بھیجی ہوئی شاندار پتلون پہنے ہوئے تھے۔ ڈرتے ڈرتے سامنے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک صاحب بڑے زور زور سے غالب کا یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔

یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایک بھی کیوں ڈھونڈ رہے تھے۔ شاید اکیلے میں طبیعت گھبرا رہی ہوگی یہ تھا ہمارا پہلا دن کالج میں جس میں پڑھائی تو کوئی خاص نہ ہوئی لیکن ایک مسئلہ حل ہوگیا جو کافی عرصہ سے ہمارے لیے وبالِ جان تھا یعنی اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کا مفہوم پتہ چل گیا کہ!

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ذوقِ سخن کی آزمائش

جوابات

۱:- الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں۔
۲- خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
۳:- کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا۔
۴:- دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
۵:- رات کو خوب سی پی صبح کو توبہ کرلی۔
۶:- خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں۔
۷:- پھر ملیں گے اگر خدا لایا
۸:- تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ۔
۹:- نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
۱۰:- دیکھ ہی لیں گے اِشارہ سرِ محفل جو کیا۔
۱۱:- نزاکت نازنینوں کے بنائے سے نہیں بنتی
۱۲:- چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
۱۳:- کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
۱۴:- نہیں اقبالؔ نا اُمید اپنی کشتِ ویراں سے۔
۱۵:- نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
۱۶:- وائے نادانی کے وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا۔
۱۷:- میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
۱۸:- راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں۔
۱۹:- محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔
۲۰:- رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

ہم ایک طالبِ علم ہیں

محمد الیاس مغل
سیکنڈ ائیر ڈپری انجنیئرنگ

اہلِ علم اور قواعد دان اصحاب نے عنوان پڑھتے ہی اپنے کان کھڑے کر لیے ہوں گے کہ یہ کیسا فقرہ ہے جس میں متکلم کے ساتھ صیغۂ جمع اور "ایک" استعمال ہوا ہے۔ جملے کی ترکیب کچھ یوں ہوتی کہ "میں ایک طالب علم ہوں" یا "ہم طلبہ ہیں" تو شاید درست ہوتا۔ ان کا اعتراض بجا لیکن آخر ہم بھی تو ایک طالبِ علم ہیں۔ ہماری رائے میں اگر بیان قواعد پر غالب آ جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر بیان نہ ہوگا تو قواعد کو کہاں استعمال کیا جائیگا۔ یوں ہم قواعد سے بالکل کورے بھی نہیں۔ جملے کی دونوں صورتیں ہماری نظر میں تھیں۔ لیکن ہمارا اظہارِ مطلب ٹھیک طرح سے نہیں ہوتا تھا۔

اصل میں غلط فہمی کا امکان اس لیے پیدا ہوا کہ ہماری زبان کے قواعد میں صیغوں کے باب میں ایک کمی ہے۔ صیغۂ جمع کا استعمال تعداد کے اعتبار سے بھی کیا جاتا ہے اور تعظیم کے اعتبار سے بھی۔ ہمارا اپنا خیال اس سلسلہ میں یہ ہے کہ تعداد اور تعظیم کی جمع کے درمیان فرقِ امتیاز ضروری ہے۔ اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ایک نئے صیغے کا اضافہ کر دیا جائے۔ تعداد کی صورت کو "صیغۂ جمع" اور تعظیم کی صورت کو "صیغۂ ادب" کہہ دیا جائے۔ اس طرح اس نئے صیغے کے تحت اس قسم کے تمام جملے آ سکیں گے۔

"صدر امریکہ پاکستان تشریف لائے"۔۔۔۔۔ صیغۂ ادب غائب

"ابا جان آپ کہاں گئے تھے" صیغۂ ادب حاضر

"مانا کہ ہم چغد ہیں لیکن آخر آپ کے بڑے بھائی ہیں" صیغۂ ادب متکلم

عنوان پر ہم نے جان بوجھ کر چھیڑی۔ ایک تو ہم قارئین پر اپنی علمی بلاغت اور تحقیق کا رعب ڈالنا چاہتے تھے، دوسرے عزتِ نفس کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ مفروضے کو مان لینے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ ورنہ ہم اظہارِ تعظیم کے استعمال پر بھی اعتراض کرتے۔ (کہ بات بات پر اعتراض کرنا ہماری خو ہے) اور دریافت کرتے کہ آخر جمع کو واحد سے زیادہ کیوں معزز سمجھا جاتا ہے۔

خدا؟ تو واحد ہونے اور واحد کہلانے میں عزت محسوس کرتا ہے۔ تعجب ہے انسان جو ہر معاملے میں خدا کی ہمسری کرتا ہے بلکہ خود خدا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے لیے صیغۂ جمع (ہماری تحقیق کے مطابق "صیغۂ جمع ادب") استعمال کروانے میں عزت محسوس کرتا ہے۔

بہر حال ہم ایک طالبِ علم ہیں۔ یعنی باوجود مذکورہ بالا اعتراض کے، ہم بھی عزت و تعظیم کے مارے جمع کے طلسم میں گرفتار ہیں۔

ابتداء میں ہمارا خیال تھا کہ لوگ جو تعلیم اور طالب علموں کو اچھا جانتے ہیں، ٹھیک ہی ہوگا۔ اور اسکول و کالج کے چکر میں ہم پڑے بھی اسی وہم کے سبب تھے۔ خوبصورت کالج کی یونی فارم ہوگی، دو ایک کتابیں اور ایک عدد دیدہ زیب سیاہ رنگ کی فائل بغل میں۔ آج کبھی کبھی خیال کرتے ہیں کہ

والد صاحب کا کہا مان کر اگر اپنے آبائی پیشے کو فروغ دیتے تو آج کھڈی کی جگہ جدید ٹیکسٹائل مل ہوتی۔

میٹرک کے بعد ہم بڑے بھائی کے ساتھ برف بیچنے کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ بدقسمتی سے جلد ہی خرابی پیدا ہو گئی ہوا یوں کہ ایک دن بڑے زور کی بارش ہوئی اور دن خاصا ٹھنڈا ہو گیا۔ شام تک صرف پانچ بلاک بک سکے۔ پندرہ باقی بچ رہے۔ اگلے دن سخت حبس اور گرمی تھی۔ بھائی کی غیر حاضری میں ہم نے ایک ہی گاہک کے ہاتھ پہلے دن والی بچی ہوئی برف ایک چوتھائی قیمت پر بیچ دی۔ بھائی کو پتہ چلا تو غصے سے لال بھبھوکا ہو گئے۔ ہم نے کہا برف باسی تھی کیا برا کیا جو چوتھائی قیمت پر بیچ دیا۔ وہ بولے "الو کہیں کے (حالانکہ میں انہیں کے گھر کا ہوں) تو نرا بے وقوف ہی رہا۔ تجھ سے زیادہ تو بھینس میں عقل ہوتی ہے۔ جا کہیں جا کر عقل سیکھ اور کچھ پڑھ پڑھا لے۔ بس جناب اسی دن سے ہم نے کالج میں داخلہ لے لیا لیکن اختلافِ رائے آج تک قائم ہے۔ یعنی وہ کل کے جمے ہوئے برف کو تازہ سمجھتے ہیں اور ہم اسے باسی جانتے ہیں۔

لفظ "طالبِ علم" اور کالج کی زندگی ہمیں بے انتہا عزیز ہے۔ محلے میں سب ہم کو "کالج بوائے" "کالج بوائے" کہتے ہیں ہم اس کی خاطر ہم نے اپنے خاندانی فن کو بھی خیر آباد کہہ دیا۔ جب بغل میں دبائے سیاہ گتے کی فائل، گردن اکڑائے جدید تراش کی پتلون زیب تن کیے ہوئے بازار میں سے ہم گزر رہے ہوتے ہیں اور دو چار نگاہیں ہماری طرف اٹھتی ہیں تو ایک عجیب سرور ہمارے حواس پر چھا جاتا ہے۔ کالج کے تمام استادوں کی ہم نظروں میں ہیں۔ ہم نے بے انتہا غور و خوض کے بعد ایک مستقل نظریہ وضع کیا ہے اور اس سلسلہ میں اعداد و شمار اکٹھے کیے ہیں۔ پڑھانے کے اعتبار سے پروفیسروں اور لیکچراروں کی تین قسمیں ہیں کوئی دس فی صدی استاد تو پرانی وضع کے ہیں جو ہم طلباء کو اپنی اولاد کی طرح بلکہ بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ نہایت محنت اور توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ طلبہ جب تک ان سے پڑھتے ہیں، ان کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ لیکن جب اگلے درجات میں پہنچ جاتے ہیں تو انہیں دقیانوسی اور پرانی ذہنیت کا استاد سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس ان کے علم کی انتہا وہیں تک تھی جس درجے تک انہوں نے ان سے پڑھا ہے۔

پھر چالیس فیصدی کے قریب وہ استاد ہیں جو صرف پڑھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور خیال نہیں کرتے کہ جو کچھ انہوں نے پڑھایا ہے وہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی سمجھ میں آ بھی گیا ہے کہ نہیں ان کا کہنا ہے کہ لڑکے پڑھیں نہ پڑھیں ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے بس اسی طرح کلاس میں آئے لیکچر دیا اور چل دیئے۔

اس کے بعد پچاس فیصد کے لگ بھگ ان اساتذہ کی تعداد ہے جو اپنی نمود و نمائش پر زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں طلباء پر ذہنی قابلیت کا اتنا رعب نہیں پڑتا جتنا کہ لباس کی تراش خراش اور وضع قطع کا۔ جب کوئی طالبِ علم کلاس میں کوئی پریشان کن سوال پوچھ لیتا ہے تو پہلے کچھ کھنکارتے ہیں۔ اپنے لباس کی شکنیں درست کرتے ہیں پھر گویا ہوتے ہیں کہ "ابھی ابھی ہم نے یہ نکتہ حل کیا تھا۔ تم سو رہے تھے کیا؟ بیٹھ جاؤ، تمہاری خاطر ہم ساری کلاس کا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" یا کچھ اس طرح اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی آپ کی طرح انسان ہیں۔ بھول ہم بھی جاتے ہیں۔ اچھا کل ہم دیکھ آئیں گے۔ اسطرح بات کل سے کل پر ٹلتی جاتی ہے اور پھر ماضی کا حصہ بن جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ لفظ "طالبِ علم" ہمیں بے انتہا عزیز ہے۔ یہ ہمارے لیے ایک اعزاز و تکریم ہے۔ ہمارا اصل مقصد حصولِ علم نہیں ہے۔ بلکہ اعزاز کا دفاع اور عزت ہے۔ اس عزت کی خاطر ہم نے کئی چکر چلا رکھے ہیں۔ کھانا ہم وقت پر کھاتے نہیں۔ صبح جلدی اٹھتے نہیں۔ سیر کو نکلتے نہیں۔ ہاضمہ اور نیند ہم

باقی صفحہ نمبر ۶۸ پر

ایک یادگار کرکٹ میچ

محمد ندیم جمیل
فرسٹ ایئر میتھس

زمانہ ترقی کی راہوں پر خواہ کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل جائے وہ کبھی بھی حسن کے احساس کو مٹا نہیں سکتا۔ یہ حسن کاری چاہے کسی شاعر کے اشعار میں ہو یا مصور کے خطوط میں، کسی مجسمہ ساز کے بت میں ہو یا کسی کھلاڑی کے کھیل میں، ہر زمانے میں لوگوں کو متاثر کرتی چلی آئی ہے۔

آج مجھے ان گذرے ہوئے دنوں کی یاد آ گئی ہے جب پاکستان میں کرکٹ کا سیزن شروع ہونے والا تھا۔ ہر طرف ان دنوں کرکٹ ہی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی کسی ٹیم کی حمایت میں بولتا ہوا نظر آتا تو کوئی اس کی پر زور مخالفت کرتا۔ کوئی اپنے پسندیدہ کھلاڑی کی خوبیاں گنواتا تو کوئی ناپسندیدہ کھلاڑی کو نااہل ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ دوستوں کی محفل ہو یا بزرگوں کی پنچائیت۔ یہ موضوع ضرور کسی نہ کسی شکل میں زیر بحث آتا۔ غرض گلی گلی، گھر گھر، بازاروں، دکانوں اور تعلیمی درسگاہوں میں کرکٹ ہی کے چرچے تھے۔ ذرائع ابلاغ نے بھی خود کو کسی سے پیچھے نہیں رہنے دیا۔ اخبارات اور رسائل نے دلچسپ مضامین تحریر کئے اور انہیں شہرہ آفاق کھلاڑیوں کی رنگین رنگین تصاویر سے آراستہ کیا جس کو پڑھ کر کرکٹ کے دلدادہ اس دن کے منتظر نظر آتے تھے۔ جب ایک روزہ انٹرنیشنل میچ ان کے اپنے شہر میں ہو۔ اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ اور ان نامور کھلاڑیوں کے انٹرویوز اور اس سیریز سے متعلق کرکٹ کے ماہرین کے تبصرے بھی ٹیلی کاسٹ کئے اور ان تمام میچوں کو براہ راست ٹیلی کاسٹ کرنے کے لئے خصوصی انتظامات کئے کچھ ایسا ہی حال ریڈیو کا تھا۔

جوں جوں ہمارے اپنے شہر حیدرآباد میں کھیلے جانے والے ایک روزہ انٹرنیشنل میچ کا دن قریب آتا جا رہا تھا۔ اس مصروف اور مقابلہ کی دوڑ کے زمانے میں اتنی گہما گہمی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر بچہ، مرد و عورت کی یہی آرزو تھی کہ یہ دن جلد از جلد آ جائے اور پھر وہ دن آ ہی گیا جب پاکستان اور آسٹریلیا کی ٹیموں کے درمیان کھیلا جانے والا ون ڈے انٹرنیشنل حیدرآباد کے نیاز اسٹیڈیم میں شروع ہونے والا تھا۔

ہم سب دوستوں پر مشتمل ایک ٹیم جو چند چھتریوں اور دوربینوں سے آراستہ تھی، اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا اور ایک عدد ٹرانسسٹر ریڈیو لے کر ایک قافلہ کی صورت میں اپنی منزلوں کی طرف بڑھی۔ راستے میں ہنسی مذاق اور ادھر ادھر کی باتوں میں پتہ ہی نہ چلا کہ راستہ کب طے ہو گیا۔ ہوش آیا تو ہم سب نیاز اسٹیڈیم کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہم میں سے کچھ نے

اور کچھ نے ان ٹکٹ لینے والے دوستوں کو سامان پکڑایا اور خود بغیر ٹکٹ اندر داخل ہونے کے مواقع کا جائزہ لینے میں لگ گئے۔ سینکڑوں لوگ رنگ برنگ لباس پہنے اسٹیڈیم کی طرف قدم بڑھاتے چلے آ رہے تھے آنے والے ابھی اندر داخل ہو نہیں پاتے تھے کہ مزید آ جاتے تھے اس طرح اسٹیڈیم کے باہر بھی ہزاروں کا ہجوم تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، کھلنڈرے، شوخ، سنجیدہ، لباس رنگ رنگ کے، انداز جدا جدا، ایک نظر میں ہزار جلوے، ہر جلوے میں ہزار رنگ۔

اس کے بعد جب ہم اسٹیڈیم میں پہنچے تو وہاں پر موجود ہزاروں آدمی بالکل اس چمن کی مانند لگ رہے تھے۔ جس کی کیاریوں میں نیلے نیلے، پیلے پیلے، سرخ و سبز، اودے، سیاہ و بھورے پھولوں کے پودے بڑی نفاست اور ترتیب سے لگائے گئے ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

ع:- پھول ہیں گلشن میں یا پریاں قطار اندر قطار
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیرہن

اندر پہنچنے کے بعد ہمیں اپنے دوسرے دوستوں کی فکر ہوئی اور سوچنے لگے کہ وہ بغیر ٹکٹ کے اندر آ بھی سکیں گے کہ نہیں۔ مگر ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہمارے دوست بھی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ پر چوٹ کی نشانی دیکھ کر میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ چند سپاہیوں نے ہماری حرکات سے ہمارے مجرمانہ عزائم کا اندازہ کر کے ہمیں پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بچانے کے لئے دوڑ لگا دی۔ سپاہی مفرور مجرم کے پیچھے دوڑ لئے۔ دوست راستہ صاف پا کر رسیوں کے ذریعہ اندر کود گئے۔ دوستوں کی کامیابی کے بعد میں نے بھی ایک رسی کو ذریعہ بنایا اور اندر کود گیا کیونکہ عجلت اور بدحواسی طاری تھی اس لئے چھلانگ اونچائی سے بڑھ کر لگا دی۔ نتیجے میں ہاتھ پر اس واردات کی سرخی جما لی۔ (رسی سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ اسے وہاں کود نے ہمارے لئے لٹکایا گیا تھا بلکہ یہ وہ رسی تھی جس سے شامیانے تانے جاتے ہیں) داستان سنا کر اس نے ہم سب کو بہت ہنسایا اور خود بھی بڑے فخریہ انداز میں قہقہے لگانے لگا۔ اسی دوران تالیوں کی گونج میں میدان میں دو امپائر داخل ہوئے اور وسط میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت سارا اسٹیڈیم کچھا کھچ بھر چکا تھا مگر تماشائی تھے کہ ہزاروں کی تعداد میں مسلسل چلے آ رہے تھے۔ یہ سب لوگ جو مختلف رنگ برنگے اور مختلف طرز کی پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھے۔ اس شاہی باغ کی مانند لگ رہے تھے جس میں سبزے کے بڑے بڑے میدان ہوں اور ان کے چاروں اطراف مختلف رنگوں کے انواع واقسام کے پھول مہک مہک کر دلوں کو تازگی اور فضا سے خوشبو سے معطر کر رہے ہوں اور ان کے درمیان میں موجود دو امپائر اس طرح کھڑے تھے جیسے سبزہ کے درمیان کے درمیان سیاہ و سفید گلاب اگے ہوئے ہوں۔ اسی اثناء میں دونوں ٹیموں کے کپتانوں کے درمیان

ٹاس ہوا۔ جس میں آسٹریلین کھلاڑی اور کپتان کم ہیوز کو کامیابی حاصل ہوئی اس طرح کپتان ہیوز نے ٹاس جیت کر پاکستان کو پہلے بیٹنگ کرنے کی دعوت دی۔ جب آسٹریلین ٹیم اپنے قائد کی نگرانی میں گراؤنڈ میں داخل ہوئی تو ہزاروں کی تعداد میں موجود تماشائیوں نے پرجوش انداز میں آسٹریلین ٹیم کے کھلاڑیوں اور پاکستانی بیٹسمینوں کو خوش آمدید کہا ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے ہجوم نے تالیاں بجائیں۔ اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے سبز ہلالی پرچم اور رنگین بینروں کو ہلا ہلا کر "پاکستان زندہ باد"، "ظہیر عباس ایشین بریڈمین زندہ باد" اور "جاوید میانداد زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے اس موقع پر لوگوں کے چمکتے اور دمکتے ہوئے چہرے ان کی اندرونی خوشی و مسرت سے سجے ہوئے تھے۔ اسی لمحہ کسی مستانے کی لہک لہک کر گانے اور الغوزہ بجانے کی آواز نے ہنگامہ شور و غل کو پرسوز اور دلپسند موسیقی میں بدل ڈالا۔ اس موقع پر اگر موسم کا ذکر نہ کیا جائے تو بڑی زیادتی ہوگی۔ اس روز صبح ہی سے آسمان پر سفید بادل چھائے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے سفید روئی کے گالوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا ہو۔ کبھی کبھی سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر اس دلفریب اور دلکش منظر سے لطف اندوز ہو لیتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ ٹھنڈی ٹھنڈی مگر آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا نے درختوں کے سکوت کو توڑ کر انہیں بھی جھومنے اور جھوم جھوم کر گانے میں مشغول کر دیا۔ اس وقت یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسٹیڈیم سے آس پاس کئی بلند و بالا عمارات صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ عیدگاہ کا منظر بھی اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اس وقت تک اسٹیڈیم میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی۔ لہٰذا لوگ آس پاس کی بلند عمارات کی چھتوں اور اسٹیڈیم کے باہر لگے ہوئے سرو اور نیم کے درختوں پر چڑھ کر اس میچ سے لطف اندوز ہونے کے لئے بے قرار تھے۔ اس موقع پر سبزہ زار میں سفید یونیفارم میں ملبوس یہ کھلاڑی ایسے لگتے تھے جیسے سبز رنگ کے سمندر میں سفید رنگ کی مرغابیاں ادھر سے ادھر تیر رہی ہوں۔

اسی اثنا میں پاکستانی اوپنروں مدثر نذر اور نہایت ہی جارحانہ انداز سے بیٹنگ کرنے والے محسن حسن خان نے شروع میں دفاعی انداز سے بیٹنگ کرنے کے بعد اپنے دلکش جارحانہ اور شاندار چوکوں اور چھکوں کی مدد سے پاکستان کی پوزیشن کو کافی حد تک تسلی بخش بنا دیا مگر حیف تھامسن کی ایک بال نے مدثر نذر کو پویلین واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا نئے آنے والے کھلاڑی محسن کو خاطر خواہ سپورٹ نہ دے سکے۔ جس کی وجہ چند لمحوں پہلے لوگوں کے چمکتے دمکتے چہرے اور پھول کی مانند کھلے ہوئے چہرے کسی گہری سوچ کی آندھی میں کملا گئے! چند لمحوں پہلے پورا اسٹیڈیم جو خوشبوؤں کا مسکن بنا ہوا تھا اب اس پر غم کے بادل چھا گئے اور سارا اسٹیڈیم خاموشی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا کہ ایسے میں مایہ ناز بیٹسمین ظہیر عباس نے اپنی جارحانہ دلکش اور بے مثال بیٹنگ سے ان مرجھائے ہوئے دلوں کو خوشی سے بھر دیا اور ایک بار پھر پورا اسٹیڈیم ہا ہا،

ہو گیا اور نہ جانے کیسی کیسی آوازوں سے گونج اٹھا اور پرجوش تالیوں کی آوازیں کانوں میں رس گھولتی ہوئی دلوں کو گرمانے لگیں اس موقع پر کبھی کبھی کوئی مستانہ لہک لہک کر گاتا اور الغوزہ بجا بجا کر اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کرتا۔

یہ پاکستانی بیٹسمینوں اور آسٹریلین بالروں کی جنگ تھی جس میں اس وقت پاکستان کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ اسی اثنا میں محسن حسن خان نے اپنی شاندار اور صحیح معنوں میں پروقار سنچری بنالی۔ اس سنچری میں انہوں نے کئی چھکے اور چوکے مارنے کے علاوہ کرکٹ کی کتاب میں درج شدہ ہر وہ شارٹ کھیلا جو ایک اچھا بیٹسمین کھیلنا چاہتا ہے جیسے ہی محسن کی سنچری ہوئی عوام نے زوردار تالیوں اور پرجوش نعروں سے محسن کے کھیل کی تعریف اور چند لوگوں نے گراؤنڈ میں جا کر محسن حسن خان کو پھولوں کے ہار پہنائے اور واقعی اس کھلاڑی کا کارنامہ تھا بھی اسی قابل۔ اس خوشی کے موقع پر قسمت پھر پاکستانی عوام سے روٹھ گئی اور محسن حسن خان بولڈ ہو گئے۔ اور ایشین بریڈمین ظہیر عباس کو بروس یارڈلی نے ٹلیس کے ہاتھوں کیچ آؤٹ کرا کے پیچ کو اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت سب کی نظریں ایک ہی آدمی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ سب کے دلوں کی دھڑکن کا ایک ہی ساز تھا اور سب کی توقعات کا رکھوالا ایک ہی کھلاڑی تھا۔ ایک ہی ملاح تھا جو اس کشتی کو جو طوفان سے بچ کر بھنور میں آ پھنسی تھی، بھنور سے نکال سکتا تھا جو اس نیا کو پار لگانے کی صلاحیت رکھتا تھا وہ تھا جاوید میانداد۔ جاوید اور سلیم ملک نے آخری اوورز میں اتنی تیز، جارحانہ اور شاندار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا جس کی مثال بہت کم مرتبہ پیش ہوتی ہے۔ اس طرح پاکستان نے مقررہ ۴۰ اوورز میں ۲۹۸ رنز بنا کر اپنی اننگز کا اختتام کیا۔ اس وقت جاوید اور سلیم دونوں ناٹ آؤٹ تھے۔

پاکستانی اننگز کے بعد ہم سب نے اسٹیڈیم سے ملحقہ عیدگاہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر منہ دھونے کے بعد ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا اور نماز جمعۃ المبارک ادا کی۔ اس کے بعد اب تک کے کھیل پر تبصرہ کرتے ہوئے اسٹیڈیم کا رخ کیا اور جب ہم پہنچے تو آسٹریلین اوپنروں نے ۱۵ رنز بغیر کسی نقصان کے بنا لئے تھے۔ یہ اسکور بڑھتے بڑھتے ۵۷ رنز تک پہنچ گیا۔ اس اسکور پر کلیپس کو طاہر نے توصیف کے ہاتھوں کیچ کرایا۔ اس کے بعد آنے والے بیٹسمینوں میں کم ہیوز اور ایلن بارڈر نے نہایت عمدہ اور معیاری کھیل کا مظاہرہ کیا اس موقع ایک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسٹریلیا کو اس میچ میں با آسانی فتح نصیب ہوگی مگر اس کے بعد کے آنے والے کھلاڑیوں نے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور ایک کے بعد ایک پویلین کو لوٹنے لگے۔ اس لمحے جلال الدین نے تھامسن، راسن اور راڈنی مارش کو آؤٹ کر کے نہ صرف ہیٹ ٹرک کی بلکہ پاکستان کے پہلے ہیٹ ٹرک کرنے والے کھلاڑی کا بھی اعزاز حاصل کیا۔ یہ ہیٹ ٹرک کرنے والے کھلاڑی کی ون ڈے میچز میں پہلی اور اکلوتی کامیابی تھی اسی طرح وکٹیں گرنے سے آسٹریلین جیت سے بہت دور ہوتے گئے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب آسٹریلیا کا ایک کھلاڑی باقی تھا اور اسکور ایک اوور میں ۳۵ رنز کی صورت میں تھا۔ مگر آخری اوور میں صرف ۳ رنز بن سکے اور آخری بال پر کریگ چیپل

کوٹ بیہاشنڈ ہوگئے۔ اس طرح یہ دلچسپ میچ اختتام کو پہنچا۔ اس وقت تمام پاکستانی کھلاڑی خوشی سے کھل رہے تھے ان کے چہرے، ان کی خوشی اور کامیابی سے چمکمارہے تھے۔ اسی طرح پاکستانی عوام میں بھی لوگ خوشی سے جھوم رہے تھے اور پرزور تالیوں سے اور پاکستانی پرچموں اور جھنڈوں کو لہرا لہرا اپنی خوشی ومسرت کا اظہار کررہے تھے۔ اسی لمحہ بھر اسی الغوزہ بجا بجا کر لہک لہک کر گانے والے ستانے کی آواز نے سب کو اپنی پُر سوز اور خوشیوں کا پیغام لئے میٹھی اور سریلی آواز نے اپنی پُر مسرت آواز کے جادو سے سحور کرلیا۔ اس لمحہ سرو کے درخت بھی ہلتے ہوئے ایسے معلوم ہورہے تھے جیسے وہ اس مستانہ کی آواز کے سحر میں مبتلا ہو کر جھوم جھوم کر اور لہک لہک کر اپنی مخصوص آوازیں گا رہے ہوں۔

اس لمحہ اسٹیڈیم سے ملحق عیدگاہ مسجد میں عصر کی اذان کی آواز ایسے موثر اور پرکشش انداز میں کانوں تک پہنچی اور دل میں اترتی چلی گئی۔ اس آواز کے ختم ہوتے ہی مین آف دی میچ ایوارڈ تقسیم کرنے کی تقریب ہوئی جس میں محسن خان کو ان کی دلفریب جارحانہ اور شاندار بیٹنگ کی وجہ سے "مین آف دی میچ ایوارڈ" دیا گیا۔

واپسی پر ہم سب دوستوں نے نمازِ عصر ادا کی۔ اور رب العلمین کی رحمت پر اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے پاکستان کو کامیابی عطا کی۔ جب ہم واپس آنے لگے تو شام کا جھٹپٹا تھا۔ سورج تقریباً غروب ہوچکا تھا اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ اپنے اپنے گھروں کو خوش وخرم لوٹ رہے تھے۔ اسی لمحہ میری نگاہ آسمان پر اڑتے ان چھوٹے چھوٹے پرندوں پر گئی جو بالکل ہماری طرح سینکڑوں کی تعداد میں بلندی پر آہستہ آہستہ پر ہلاتے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے

یہ دن میری زندگی کے ان چند معروف اور ہر طرح سے یادگار دنوں میں سے ایک ہے جنہیں میں اپنا آئیڈیل دن سمجھتا ہوں۔ اب بھی جب مجھے اداسی اور بوریت کا احساس ہوتا ہے تو اس میچ کی یاد سے سینہ خوشی سے بھر جاتا ہے۔

بقیہ "ہم ایک طالب علم"

نے خراب کرلی ہے۔ جب تک کہ ٹیلی ویژن پر ہمیں اپنے ملک کا سبز پرچم نظر نہیں آجاتا ہم تب تک اُٹھتے نہیں۔ بس جناب مندرجہ بالا ترکیبوں سے ہماری کچھ اس قسم کی حالت ہوگئی ہے کہ سب لیکچرز اور پروفیسر صاحبان (کہ جو ہم کو پڑھاتے نہیں بس چہرے اور نام سے شناسائی رکھتے ہیں) ہمیں راتوں کو دیر تک نہایت پڑھنے والا طالب علم سمجھتے ہیں۔ آج کل تو وی۔سی۔آر نے ہماری مشکل کو اور بھی آسان کردیا ہے۔

امتحانات ہمارے کسی امریکی ایف ۱۶ طیارے کی سی تیزی سے ہمارے سر پر آرہے ہیں۔ لیکن ہم نہایت مطمئن ہیں کہ ہمارے خفیہ ہتھیار (کارتوس) بالکل تیار ہیں۔ اگر وقت پر انہوں نے بھی جواب دے دیا اور ہماری ذہانت کا طلسم ٹوٹ بھی گیا تو کھڈیاں چلالیں گے۔ اور باپ کی آخری خواہش پوری کردیں گے یا برف بیچ لیں گے اور بھائی سے ساجھا کرلیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ماننا پڑے گا نا کہ کل کا جما ہوا برف باسی نہیں ہوتا، تازہ ہوتا ہے۔

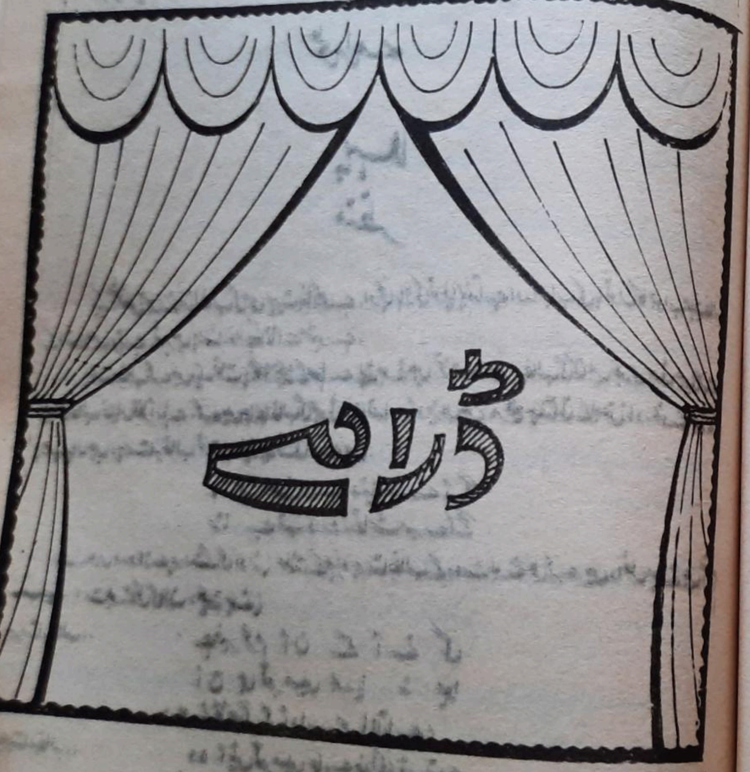

علی حیدر عرفان
انٹر سائنس

پرستارِ غالب

ڈرامہ

پہلا منظر

ایک شخص جس نے مرزا غالب کی سی ہیت بنا رکھی ہے۔ اونچی باڑ کی ٹوپی پہنتا ہے اور احباب کی باتوں کا جواب ہمیشہ غالب کے اشعار میں دیتا ہے۔ شہر میں پرستارِ غالب کے نام سے مشہور ہے۔

پرستارِ غالب کمرے میں ایک تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے لیٹے ہوئے ہیں۔ تخت اور میز پر غالب کی کتابیں بکھری ہوئی ہیں جن میں دیوانِ غالب نمایاں نظر آ رہا ہے۔ کمرے میں جا بجا غالب کی چھوٹی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔ مرقع چغتائی کے بعض نادر نمونے بھی دیوار پر چسپاں ہیں۔ پرستارِ غالب تخت پر لیٹے لیٹے گنگنا رہے ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

(صدر دروازے پر دستک کی آواز) ملازم کے ہمراہ پرستارِ غالب کے دوست بوٹے گل کمرے میں داخل ہوتے ہیں، پرستارِ غالب اپنے دوست بوٹے گل کی طرف دیکھتے ہوئے)

پرستارِ غالب:۔
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

(بوٹے گل جھک کر آداب بجا لاتا ہے)

پرستارِ غالب:۔
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

بوٹے گل:۔ اب تو بفضلِ تعالیٰ مزاجِ مبارک بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

پرستارِ غالب:۔
اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بوٹے گل:۔ کبھی ... سے نالۂ دل سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا کیا وہ آپ کی طرف تشریف لائے تھے۔

پرستارِ غالب:۔
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(صدر دروازے پر دوسری بار دستک کی آواز) (اس بار واعظِ شہر نوکر کے ہمراہ کمرے میں تشریف لاتے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں اور کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

واعظِ شہر:۔ کہیئے آپ کی اب طبیعت کیسی ہے؟

پرستارِ غالب:۔
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے میرا ترے آگے

واعظِ شہر:۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کبھی شراب نہیں پیئں گے۔

پرستارِ غالب:۔
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

واعظِ شہر:۔ آخر آپ شراب پیتے کیوں ہیں؟

پرستارِ غالب:۔
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

واعظِ شہر:۔ آپ کو معلوم نہیں آپ کی رسوائیوں کے چرچے اب کوچہ و بازار میں پھیلنا شروع ہو گئے ہیں۔

پرستارِ غالب:۔
غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

بوٹے گل:۔ آپ اپنی صحت کی طرف نہیں دیکھتے کہ شراب نے کیا حال کر دیا ہے۔

پرستارِ غالب:۔
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

(صدر دروازے پر تیسری بار دستک، نوکر گھبرایا ہوا ایک تھانیدار اور دو سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

تھانیدار:۔ تم میں سے پرستارِ غالب کون ہے؟

پرستارِ غالب:۔
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(بوٹے گل تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے)

بوٹے گل :۔ آپ آئے کس لیے ہیں (پرستارِ غالب کی طرف دیکھتے ہوئے) انہوں نے آخر کیا جرم کیا ہے۔

(تھانیدار پرستارِ غالب کی طرف دیکھتے ہوئے)

تھانیدار :۔ یہ ان ہی سے پوچھ لیجئے۔

پرستارِ غالب :۔ قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(تھانیدار سپاہیوں کی مدد سے پرستارِ غالب کو ہتھکڑیاں لگا کر گھر سے کوتوالی لے جاتا ہے)

دوسرا منظر

کوتوال شہر اپنے دفتر میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر دفتری سامان کے ساتھ مختلف فائلیں رکھی ہوئی ہیں۔ دیوار پر ایک کلنڈر اور مختلف چارٹس آویزاں ہیں۔ کوتوال کے سامنے دوسری کرسی پر پرستارِ غالب کا قرض خواہ بگلے بھگت رائے بیٹھا ہوا ہے کچھ لمحوں بعد تھانیدار سپاہیوں کے ہمراہ پرستارِ غالب کو لے کر دفتر میں حاضر ہوتا ہے۔

کوتوال شہر :۔ آخر تم کوتوالی آ ہی گئے۔

پرستارِ غالب :۔ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

بگلے بھگت رائے :۔ اگر تم میرا قرض ادا کر دو تو مقدمہ یہاں پر ہی ختم ہو سکتا ہے۔

پرستارِ غالب :۔ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

کوتوال شہر :۔ (سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے) اس کو حوالات میں بند کر دو۔

پرستارِ غالب :۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

پرستارِ غالب کو سپاہی حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے اور ذرا سے وقفے کے بعد اٹھ جاتا ہے۔ وہی کوتوالی کا منظر۔ پرستارِ غالب اسی طرح حوالات میں بند لیکن کرسیوں پر کوتوالِ شہر اور قرض خواہ میں سے کوئی موجود نہیں۔ چند سپاہی ادھر ادھر کھڑے اور بیٹھے نظر آ رہے ہیں آہستہ آہستہ پرستارِ غالب کے گنگنانے کی آواز آ رہی ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔

(اسی دوران پرستارِ غالب کے دوست بوٹے گل حوالات میں ان سے ملنے آتے ہیں)

بوٹے گل :۔ آداب عرض کیجئے۔ کیسی گذری! کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہوئی؟

پرستارِ غالب :۔ خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

بوٹے گل :۔ میں آپ کے دولت خانے سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔ بچوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے (کہتے کہتے رک جاتا ہے)

پرستارِ غالب :۔ قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

بوٹے گل :۔ میں وکیل صاحب کے پاس بھی گیا تھا۔ وہ انشاء اللہ آج عدالت میں تشریف لائیں گے۔

پرستارِ غالب :۔ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم اُن کو خبر ہونے تک

بوٹے گل :۔ وکیل صاحب فرماتے تھے کہ وہ عدالت میں آپ کا ہر ممکن دفاع کریں گے۔ لیکن یہ ہوا بُرا۔

پرستارِ غالب :۔ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

(اسی گفتگو کے دوران سپاہی آتا ہے اور حوالات کا تالا کھول کر کہتا ہے)

سپاہی :۔ چلو عدالت کا وقت ہو گیا ہے۔

پرستارِ غالب :۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

تیسرا منظر

عدالت کا کمرہ۔ جج صاحب ایک اونچی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے میز پر ڈائری ٹیبل کلنڈر اور قلم دان رکھا ہوا ہے۔ عدالت کے کٹہرے میں پرستارِ غالب کھڑے ہوئے ہیں۔ سامنے کرسیوں پر وکیلِ استغاثہ، وکیلِ صفائی، دوسرے وکلاء اور سامعین بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ ہٹ کر بینچ پر قرض خواہ اور سپاہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ جج صاحب کی اجازت پا کر وکیلِ استغاثہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کٹہرے کے قریب جا کھڑا ہوتا ہے۔

وکیل استغاثہ :۔ (جج صاحب کو مخاطب اور پرستارِ غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) می لارڈ! ملزم عدالت میں حاضر ہے اس سے پوچھیے کہ یہ مدعی کا قرض کیوں ادا نہیں کرتا۔

(جج کاغذات دیکھتے ہوئے پھر نظر اٹھا کر پرستارِ غالب سے مخاطب ہوتے ہیں)

جج صاحب :۔ تو کون ہے۔؟

پرستارِ غالب :۔ ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

جج صاحب :۔ تیرا نام کیا ہے ؟

پرستارِ غالب :۔ ہر ایک بات میں کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

جج صاحب (ذرا سنبھل کر) تم کیا کام کرتے ہو۔

پرستارِ غالب :۔ عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جج صاحب :۔ تمہارا پیشہ بھی تو کچھ ہوگا۔

پرستارِ غالب :۔ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

جج صاحب :۔ تم نے مدعی سے قرض لیا ہے۔

پرستارِ غالب :۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جج صاحب :۔ (وکیل استغاثہ سے) تم کوئی گواہ پیش کرنا چاہتے ہو ؟

وکیل استغاثہ :۔ می لارڈ کوئی گواہ نہیں۔ یہ لین دین کا رجسٹر ہے۔ اس مدعی کے ہاتھ کے اندراجات ہیں اور اس پر کہیں کہیں خود ملزم کے اپنے ہاتھ کے بھی اندراجات ہیں۔

جج صاحب :۔ (پرستارِ غالب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) تم مدعی کا قرض کیوں ادا نہیں کرتے۔

پرستارِ غالب :۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

جج صاحب :۔ تم کو لوٹا گیا ؟

پرستارِ غالب :۔ صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

وکیل استغاثہ :۔ می لارڈ ملزم بہت ضدی اور خود سر ہے اور عدالت کے سوالات کے جوابات سیدھی طرح نہیں دے رہا ہے۔

وکیلِ صفائی :۔ می لارڈ وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ کسی سوال کا جواب شعر میں دینا توہینِ عدالت میں شمار نہیں ہو سکتا۔ تعزیراتِ پاکستان میں ایسی شق نہیں۔

مدعی :۔ (کھڑا ہوتا ہے اور جج صاحب سے کچھ کہنے کی اجازت کے بعد عرض کرتا ہے) جناب میں اپنا قرض معاف کرتا ہوں ملزم کے لیے شہر میں رسوائی کی سزا بہت کافی ہے۔

پرستارِ غالب :۔ کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جج صاحب :۔ (ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے) تمہیں کچھ کہنا ہے ؟

پرستارِ غالب :۔ رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

جج صاحب :۔ عدالت ملزم کو سیدھی طرح جواب نہ دینے پر توہینِ عدالت کا مجرم تصور کرتی ہے۔ اس لیے عدالت ملزم کو سات روز قید بامشقت کی سزا دیتی ہے۔

پرستارِ غالب :۔ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

وکیل صفائی :۔ می لارڈ جو شخص اس وقت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے وہ ایک نامور شاعر رہا ہے اور شاعری ہی اُس کا اوڑھنا بچھونا۔ ایسی سزا سچے فنکاروں کی دل شکنی کا باعث ہوگی۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ ملزم کا باعزت طور پر بری کر دیا جائے۔ مدعی بھی اپنا قرض معاف کر چکا ہے۔

جج صاحب :۔ وکیل صفائی کی درخواست کی روشنی میں عدالت ملزم کو عدالت سے دھکا دیکر باہر نکالے جانے کی سزا دیتی ہے۔
عدالت کے ہرکارے آگے بڑھتے ہیں اور پرستارِ غالب کو کٹہرے سے باہر نکال کر دروازے سے باہر دھکا دے دیتے ہیں۔

پرستارِ غالب :۔ نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

(پردہ گرتا ہے)

چور اور چوکیدار

وسیم احمد
انٹرمیڈیٹ

کردار

۱۔ احمد حسین ________ ایک غریب کلرک
۲۔ نجمہ ________ احمد حسین کی بیٹی
۳۔ سلمیٰ ________ احمد حسین کی بیوی
۴۔ ایک چور
۵۔ دو سپاہی

پہلا منظر

(احمد حسین کا مکان ۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا ہے ۔ مکان کے صحن میں ایک طرف چارپائی پر احمد حسین دوسری طرف سلمیٰ اور نجمہ سو رہی ہیں۔ مکان کا واحد کمرہ بند ہے اور باہر سے تالا لگا ہے ۔ شاید چوروں کے ڈر سے ۔ کیونکہ اگلے ماہ احمد حسین کی بیٹی سلمیٰ کی شادی ہونے والی ہے ۔ اور شاید کمرے میں جہیز رکھا ہے ۔ اچانک دیوار پر ایک سایہ نمودار ہوتا ہے ۔ اور صحن میں کود جاتا ہے۔ سائے نے اپنا منہ چادر میں چھپا رکھا ہے۔ شاید وہ کوئی چور ہے ۔ اچانک چور کا پاؤں زمین پر پڑی تپائی سے ٹکرا جاتا ہے۔ تپائی گرنے کی آواز سن کر احمد حسین کی آنکھ کھل جاتی ہے ۔)

احمد حسین:۔ کون ہے؟ (کھانسنے لگتا ہے ۔ پھر اپنی بیوی سے) ارے اُٹھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید گھر میں کوئی ہے ۔

سلمیٰ:۔ (آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھتی ہے) تمہیں وہم ہوا ہوگا۔

احمد حسین:۔ نہیں! ابھی میں نے تپائی گرنے کی آواز سنی تھی ۔

سلمیٰ:۔ (ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) مگر یہاں تو کوئی نہیں ۔ میرا خیال ہے بلی ہوگی ۔

احمد حسین:۔ ٹھہرو ۔ میں بتی جلاتا ہوں ۔

(احمد حسین اُٹھ کر بتی جلانے کے لئے دیوار کی طرف جاتا ہے ۔ آنگن کے دوسرے اندھیرے کونے میں کھڑا چور بڑبڑاتا ہے ۔ جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔)

چور:۔ (خود کلامی کے انداز میں) اگر اس نے بتی جلا دی تو میں نظر آجاؤں گا ۔

(بتی جلتی ہے ۔ چور تیزی سے بیچ آنگن میں آ جاتا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں پستول ہے ۔)

چور:۔ ہینڈز اپ! ہاتھ اوپر اٹھاؤ ۔ ہلنے کی کوشش مت کرنا۔

(چور میاں بیوی دونوں کو ایک طرف کھڑا کر دیتا ہے ۔ اتنے میں نجمہ بھی اٹھ جاتی ہے ۔ ایک لمحے کے لیے اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔)

نجمہ:۔ (خالی الذہنی سے) یہ کون ہے؟

چور:۔ خاموش رہو لڑکی اور چپ چاپ ایک طرف کھڑی ہو جاؤ ۔

سلمیٰ:۔ (روتے ہوئے) تم کیا چاہتے ہو بھائی؟

چور:۔ (تمسخر اڑاتے ہوئے) میں کیا چاہ سکتا ہوں ۔
(جیسے بات بنانے کی کوشش کر رہا ہو)

احمد حسین:۔ ہاں ہم غریبوں سے تمہارا کیا تعلق ۔ تم شاید غلطی سے ادھر آ نکلے ہو ۔

چور:۔ ہوں غریبوں سے (لہجہ بدل کر) چپ چاپ اس کمرے کی چابی نکال دو ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سلمیٰ:۔ (روتے ہوئے) ہم غریبوں کو لوٹ کر تمہیں کیا ملے گا ۔ اس کمرے میں تو کچھ بھی نہیں۔

چور:۔ (ذرا تیز آواز میں) چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ کمرے کی چابی ادھر دو ۔ (سلمیٰ جان کے خوف سے کمرے کی چابی دے دیتی ہے)

(چور سب کو پستول کی زد پر رکھ کر کمرے میں داخل ہو جاتا ہے ۔)

دوسرا منظر

(احمد حسین کے مکان کا کمرہ ۔ کمرے میں احمد حسین اسکی بیوی اور بیٹی ایک طرف کھڑے ہیں۔ احمد حسین کے چہرے پر فکر اور اضطراب کی لہریں ہیں ۔ جبکہ اس کی بیوی اور بیٹی چپکے چپکے رو رہی ہیں ۔ کبھی کبھار ان کی کوئی سسکی سنائی دے جاتی ہے ۔ زمین پر چور بیٹھا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں کچھ اور روپے ہیں اور اس کے سامنے ٹین کا بکس کھلا پڑا ہے ۔)

چور:۔ (اُٹھتے ہوئے) بڑھیا تو تو کہتی تھی کچھ نہیں ہے ۔ ادھر تو بڑا مال چھپا رکھا ہے ۔

سالمی :۔ (سسکتے ہوئے) یہ میری بیٹی کے جہیز کے لئے ہے۔

چور :۔ (مکاری سے) ہوں! جہیز کے لئے!

سلمیٰ :۔ (منت کرنے والے انداز میں) ہم نے ساری زندگی محنت کرکے اپنی بیٹی کے لیے یہ جہیز بنایا ہے۔ اگلے

ماہ اسکی شادی ہونے والی ہے۔ (رونے لگتی ہے) بھائی اگر تم یہ سب لے جاؤ گے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے

بھائی یہ مت لے جاؤ۔

چور :۔ (مذاق اُڑاتے ہوئے) ہوں! نہیں لے جاؤں۔

سلمیٰ :۔ (فریاد کرنے کے انداز میں) بھائی! پھر ہم اس کی شادی کیسے کریں گے؟

چور :۔ (تمام چیزیں پوٹلی میں باندھتے ہوئے) یہ میرا نہیں تمہارا مسئلہ ہے۔

احمد حسین :۔ (روہانسا ہوکر) تمہیں کیا ملے گا ہماری بربادی دیکھ کر۔

سلمیٰ :۔ (کوسنے کے انداز میں) خدا کے قہر سے ڈرو......... کیوں معصوم بچی کی زندگی تباہ کر رہے ہو۔

چور :۔ (غصے سے) چپ کر بڑھیا۔

سلمیٰ :۔ (ہذیانی انداز میں) میں چپ نہیں ہوں گی۔ تم یہ لے جانا چاہتے ہو تو ہمیں بھی مار جاؤ آخر ہمارا.....

احمد حسین :۔ (بات کاٹتے ہوئے) چپ ہو جاؤ سلمیٰ۔

نجمہ :۔ چپ ہو جائیے اَمّی (جیسے خود پر اختیار نہ رہا ہو) آخر ہمارا اس طرح سسک سسک کے جینے سے کیا فائدہ

...... مار دو ہمیں بھی۔ کیا تمہاری کوئی ماں بہن نہیں۔ کوئی بیٹی نہیں۔ اگر کوئی ان کی زندگی اس طرح

تباہ کردے تو۔

چور :۔ چپ رہو (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور احمد حسین کے ہاتھ پاؤں باندھتا ہے۔ احمد حسین کے بعد نجمہ اور سلمیٰ کے ہاتھ

بھی باندھ دیتا ہے)

سلمیٰ :۔ (آخری حربے کے طور پر) بھائی کیا تمہارے دل میں رحم نہیں اور تم کیا.........

چور :۔ یہ عورت تو کان کھا گئی ہے۔ (سلمیٰ کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا ہے اور کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر

ایک طویل نیم روشن اور ویران گلی ـــ دونوں طرف مکانات کی قطاریں بھی جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

چور اس گلی میں سے گزر رہا ہے۔ اپنے چاروں طرف سے ہوشیار ـــ ہر قدم پھونک پھونک اُٹھا رہا ہے۔ بھی

چونک چونک پڑتا ہے۔ پس منظر میں سلمیٰ اور نجمہ کی فریادیں اور سسکیاں کبھی مدھم، کبھی تیز اُبھر اُبھر کر آ رہی ہیں

اچانک ایک اور آواز سب آوازوں پر غالب آجاتی ہے۔ یہ اسکی تین سالہ بچی کی آواز ہے۔ ٹوٹی پھوٹی زبان

اسکی بھولی باتیں۔ کچھ ادھوری۔ کچھ پوری۔ کچھ واضح ـ کچھ غیر واضح سنائی دے رہی ہیں۔ وہ اپنے ابا سے

فرمائش کر رہی ہے۔ کھلونوں کی۔ کانوں کی بالیوں کی۔ اپنی بچی کی آواز سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی

چور :۔ (جیسے بڑبڑا رہا ہو) میں کل ہی تیرے لئے ڈھیر سارے کھلونے لاؤں گا اور سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں بھی۔

...... اتنے میں ایک اور آواز پوری فضا پر چھا جاتی ہے۔ یہ اس کی اپنی آواز ہے۔ آواز میں گونج ہے۔ ٹھہراؤ

...... اور مغلوب کر دینے والا انداز ـــ یہ اس کے ضمیر کی آواز ہے۔

چور کا ضمیر :۔ کیا تو کسی کی بیٹی کی زندگی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ صرف اس لئے کہ تیری بیٹی خوش ہو جائے۔

چور :۔ (ہکلاتے ہوئے) مگر! میں تو.........

ضمیر : تو اپنی بیٹی کے لئے محنت، مشقت کرکے کھلونے لا سکتا ہے۔ کپڑے لا سکتا ہے۔ مگر یہ سوچ کہ وہ غریب

کلرک بے چارہ کیا کرے گا۔ جب تک وہ دوبارہ اتنا کمائے گا اس کی بیٹی بڑھیا ہو جائے گی۔

چور :۔ (فریاد کرنے کے انداز میں) مگر میری بیٹی کے کھلونوں اور بالیوں کا کیا ہوگا؟

ضمیر :۔ کیا تو محنت مشقت نہیں کر سکتا۔ اپنی بیٹی کی چھوٹی سی خوشی کیلئے کسی کی بیٹی کی زندگی تباہ کر رہا ہے۔

چور :۔ (قائل ہونے کے انداز میں) لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟

ضمیر :۔ ابھی رات باقی ہے۔ ابھی وقت ہے۔ یہ سب واپس اُن کے گھر میں ڈال آ۔

(چور تھوڑی دیر تک سوچتا ہے اور پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔ اُس کے قدم واپس احمد حسین کے گھر

کی طرف اُٹھنے لگتے ہیں۔ چند قدم ہی اُٹھاتا ہے کہ اچانک سامنے سے ایک جیپ تیزی سے آتی ہے۔ وہ روشنی

میں نہا جاتا ہے۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر جیپ سے دو سپاہی تیزی سے اُتر کر اسے پکڑ لیتے ہیں)

پھلا سپاھی :۔ (دوسرے سے) ارے دیکھو! اس کے پاس پوٹلی ہے۔ شاید اس میں چوری کا مال ہے۔

دوسرا سپاھی (چور سے) ہاں بے! یہ مال کہاں سے چرایا؟

چور :۔ جناب عالی! بے شک یہ مال میں نے چرایا تھا۔ مگر اب میں یہ مال اس کے مالک کو واپس کرنے جا رہا تھا۔

پھلا سپاھی :۔ (تمسخر اُڑاتے ہوئے) مال واپس کرنے جا رہا تھا۔ چور اور لوٹا ہوا مال واپس کردے! (دوسرے سپاہی سے) ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے۔

دوسرا سپاھی :۔ (پہلے سے) اسے جیپ میں بٹھاؤ۔ تھانے پہنچ کر خود ہی سب کچھ بتا دے گا۔

(پہلا سپاہی چور کو دھکیل کر جیپ میں بٹھاتا ہے اور جیپ چل پڑتی ہے)

دوسرا سپاھی :۔ (جیپ چلاتے ہوئے) حرام خوری بھی کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے۔ وہ بھی ہم سے۔

چوتھا منظر

ایک ویران سڑک ــــ شاید شہر سے باہر کی کوئی سڑک ہے۔ اس لیے کہ مکان کی پرچھائیاں وہاں سے خاصے فاصلے پر دکھائی دے رہی ہیں۔ وہی جیپ ایک طرف سے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور عین اسٹیج کے کنارے پر رک جاتی ہے۔ سپاہی چور کو جیپ سے اُتار دیتا ہے۔

پھلا سپاھی :۔ (چور سے) تو مجھے بال بچے دار دکھائی دیتا ہے۔ تھانے پہنچ گیا تو چمڑی سلامت نہیں رہے گی۔ مجھے تجھ پر ترس آ رہا ہے۔ جا چلا جا کان دبا کر۔ (دھمکی دیتے ہوئے) لیکن آئندہ ہاتھ آ گیا تو چھوڑوں کا نہیں۔ سمجھے۔

(جیپ چل پڑتی ہے۔ چور دور ہوتی ہوئی جیپ کی لائٹ کو تکتا رہ جاتا ہے۔ اس کے کانوں میں دوسرے سپاہی کا جملہ بار بار گونج رہا ہے جو چلتی ہوئی جیپ میں سے اُس تک پہنچ گیا تھا۔ "اس مال کو ہیڈ کوارٹر پہنچنے سے پہلے آدھا آدھا کر لو .... نہیں تو ...."

(پردہ گرتا ہے)

ذکرِ حبیب

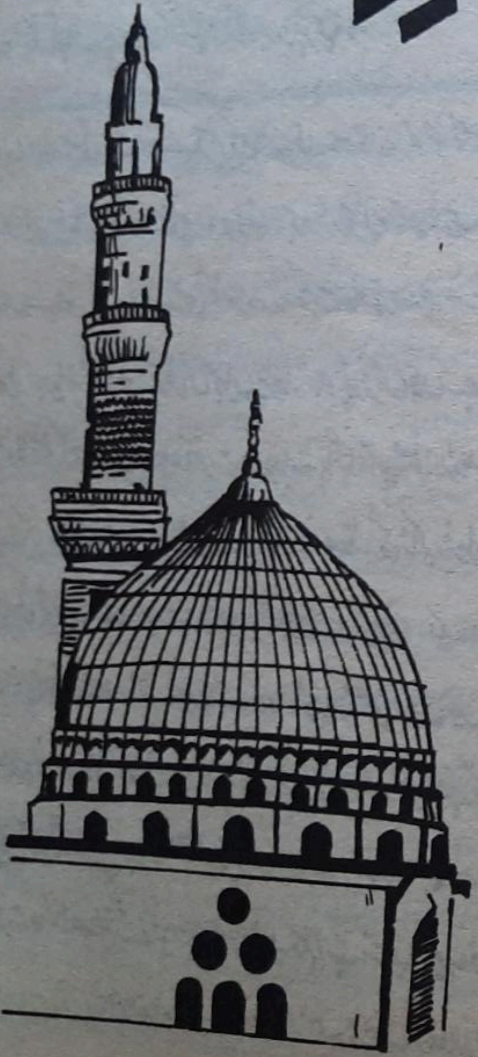

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت کا عملی پہلو

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

ترجمہ: بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

ارشد عظیم قریشی
فرسٹ ایئر میتھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے جس نے منہ پھیر لیا تو وہ خسارے میں رہے گا۔ یہ روگردانی خواہ اپنی عقل کے زور پر ہو یا کبر ونخوت پر، دونوں ہی طرح ناپسندیدہ ہیں۔ صحیح یا پسندیدہ ہونے کا معیار تو اسوۂ حسنہ کی مطابقت میں ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ رض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا۔ آپ ؓ نے جواب دیا۔ "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا" جو کچھ قرآن میں ہے وہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں۔ اور جس شخص نے نبی کریم علیہ صلوٰۃ وسلم کی پیروی کی وہ آخرت میں نجات پا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کردار اور عمل سے لوگوں کو سکھاتے تھے۔ کسی بات کی نصیحت کرتے تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ صدقہ کی تاکید فرماتے سخاوت وفیاضی کا یہ عالم تھا کہ اگر پاس ایک اشرفی بھی ہوتی تو جب تک صدقہ نہ کر دیتے چین سے نہ بیٹھتے۔ ایک دفعہ کسی صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اشرفیاں بھجوائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک وہ اشرفیاں مستحق لوگوں میں نہ بانٹ دیں، گھر تشریف نہ لے گئے اور تین دن تک مسجد میں قیام فرمایا۔ نماز کی بے انتہا تاکید فرماتے اور خود کبھی تہجد کی نماز بھی قضا نہ فرمائی۔ اکثر نماز میں اتنا اتنا قیام کرتے اور کچھ بڑی بڑی سورتیں پڑھتے کہ پیروں پر ورم آ جاتا۔ سجدے میں روتے اور اتنا روتے کہ مصلّہ بھیگ جاتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے کہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ اتنا قیام کیوں فرماتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ جل جلالہٗ کے پیارے بندے اور رسول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ "جب میرا رب جل جلالہٗ مجھ پر اتنا مہربان ہے اور اس نے مجھے اتنا بلند

مرتبہ عطا فرمایا ہے تو میں کیوں نہ اس کا شکر گزار بنوں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سرزمین عرب جہالت اور کفر وباطل میں جکڑی ہوئی تھی۔ ظلم وستم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تہذیب وتمدن کا چراغ بجھ چکا تھا۔ اس دور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! عدل وانصاف کرو۔ خود آنحضور علیہ صلوٰۃ وسلم نے یہ بات عمل سے ثابت کی، اور عربوں کے ظلم وستم کا جواب صبر وتحمل سے دیا۔ وہی قریش جو آپ کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے، زخمی کرتے تھے، فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ یتیموں کی دستگیری، غریبوں کی امداد، مظلوموں سے ہمدردی اور گمراہوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ عید الفطر کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک بچہ اکیلا بیٹھا رو رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے گھر لے گئے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا اسے نہلا کر نئے کپڑے پہناؤ یہ آج سے ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا۔

آنحضور علیہ صلوٰۃ وسلم نے ادنیٰ واعلیٰ کا فرق ختم کر دیا تھا اگر فرق تھا تو عمل کے لحاظ سے باقی تو

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

شفقت کا یہ عالم تھا کہ جنگِ طائف کے موقع پر ۲۸ دن تک شہر کا محاصرہ کیا۔ ۲۸ ویں دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں مصروف تھے کہ قلعہ سے آواز آئی۔ العطش العطش۔ کیونکہ سالارِ فوج نے پانی بند کروا دیا تھا کہ تنگ آ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے۔ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں لوگوں کو بھوکا پیاسا مارنا نہیں چاہتا۔ ۲۹ ویں دن محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ محبت وشفقت دیکھ کر طائف والوں نے اسلام قبول کر لیا، اور خالد ؓ بن ولید بھی اسلام لائے جو بعد میں سیف اللہ کے لقب سے نوازے گئے۔ عتبہ اور ابوجہل و دوسرے عرب جنہوں نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے چچا حضرت حمزہ ؓ کو شہید کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں معاف کر دیا۔ آپ کی سیرت سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مکہ فتح ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنی ایذا مجھے دی گئیں کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھیے کہ کسی سے بدلہ نہ لیا۔ یہ ظلم وستم ۱۳ سال تک جاری رہا۔ مگر فتح مکہ کے موقعہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ آج کے دن آپ سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ تم سب کو معافی ہے۔ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ لوگوں کو سادگی کی طرف راغب کرتے اور خود انتہائی درجہ کے سادہ اور مخلص ترین انسان تھے۔ کم کھاتے

اور ہلکا کپڑا پہنتے تھے۔ فرماتے تھے۔ اللہ کو سادگی بہت پسند ہے۔

جنگِ خندق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صحابہ کرامؓ کے شانہ بشانہ محنت کی اور دور دور سے پتھر اٹھا کر لائے تھے۔ تمام لوگ فاقوں سے تھے اور بھوک کی وجہ سے سب نے اپنے اپنے پیٹ پر ایک ایک پتھر باندھ رکھا تھا۔ اصحاب کرامؓ نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ کبھی کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے وہؓ بھوکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنؓ سے فرمایا کہ گھر جاؤ اور عائشہؓ سے آٹے کی ٹوکری لے آؤ۔ اور جو کچھ کھانا گھر میں تھا وہ اُن کو دے دیا۔ حالانکہ اسکے علاوہ گھر میں کچھ اور کھانے کو نہ تھا۔ خود فاقے کرتے اور دوسرے کی بھوک مٹاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے عرب معاشرے پر ایک خوشگوار اثر ڈالا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ معاشرے میں تمام لوگ برابر تھے، آپس میں بھائی چارہ تھا۔ رنگ و نسل کا فرق مٹ چکا تھا۔ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالِ حبشیؓ کو بے انتہا عزیز رکھتے تھے اور اصحابِ کرامؓ میں اُن کا ایک خاص درجہ تھا۔

اذان ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی

نماز اس کے نظارے کا اِک بہانہ بنی

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تھی کہ خدا نے اپنے محبوب کے دوست کا درجہ اتنا بلند فرمایا۔

سیدّ الکونین صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بچوں سے شفقت کی تاکید فرماتے اور خود بچوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ موسم کا سب سے پہلا میوہ بچوں کو کھلاتے تھے۔ صبر کی تاکید فرماتے۔ جھوٹ بولنے سے منع کرتے اور ہمیشہ سچ بولنے کی ہدایت فرماتے۔ آپؐ کے پیارے چچا حضرت ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ جاہل عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذہ پہنچائیں گے۔ ظلم کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ عرب اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیں تو بھی میں اسلام کی دعوت دینے اور سچ بولنے سے باز نہیں آؤں گا"۔ غرض کہ نبی کریم علیہ و صلوۃ وسلم کی ذاتِ گرامی بے انتہا مکمل اور پوری طرح جامع تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام نبیوں کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں اسلام کے بے شمار نام لیوا موجود ہیں۔ اسلام تلوار کے زور پر نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور عمل و کردار سے پھیلا۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا

خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل و انصاف

عبد الاحد عباسی
انٹر بائیلوجی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو سارے عالم کے لئے ایک مثال ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں وہ کارنامے انجام دئے جو دنیا کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آپؐ کا ہر عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ کے اخلاق ایسے تھے کہ اپنے تو اپنے غیر بھی آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے اور آپ کو امین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ آپ کے اخلاق کی سب سے بڑی اور واضح دلیل قرآن میں ہے۔

یعنی وانک لعلیٰ خُلق عظیم بے شک اے محمدؐ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ حضور اکرمؐ کی شخصیت بہت سی چیزوں کا مجموعہ تھی۔ کبھی آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں لوگوں سے پتھر کھاتے ہوئے کہیں شفیق باپ کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کہیں مہربان شوہر کے روپ میں اور کہیں آپ کی صلح جوئی اور فہم و فراست سے صدیوں کی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ غرض کہ آپ صلعم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہمارے لئے ایک سبق رکھتا ہے۔ خدا کا ہم دنیا والوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے دنیا کو ایک ایسی شخصیت مرحمت فرمائی کہ جس سے ہم ہر طرح کے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس شخصیت کے ذریعے ایک ایسا نظام زندگی عطا کیا کہ جس پر عمل کرنے والوں کو بھی دنیا والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تاریخ ایسے افراد کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں زندگی کے ہر لمحہ کو نہایت ہی فصیح و بلیغ انداز میں بیان کر دیا گیا ہے یہ واحد دین ہے جس نے لوگوں میں عدل و مساوات پیدا کرنے کیلئے زکوٰۃ کا نظام رائج کیا ہے اس کا عملی مظاہرہ اس کی عبادات میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً بنیادی عبادت نماز جس میں کوئی غریب نہیں ہوتا اور کوئی امیر امیر نہیں ہوتا۔

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے

یوں تو حضور صلعم کا ہر عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ مگر آپ صلعم کا نظام عدل و انصاف سب پہلوؤں میں سب سے زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ آپ صلعم بے شک ایک عظیم قانون داں تھے عدل کے معاملے میں آپ صلعم نے کبھی بھی کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا بلکہ سب لوگوں کو انصاف کے اس ترازو سے گذارا کہ جس میں کھرا اور کھوٹا ظاہر ہو جاتا ہے۔ انصاف کی سب سے بڑی مثال جو تاریخ انسانی میں موجود ہے وہ یہ ہے۔

ایک مرتبہ ایک یہودی آپ صلعم کے پاس اپنا قرضہ وقت سے پہلے لینے آیا اور آپؐ سے بڑی بدکلامی سے پیش آیا۔ چند صحابہ نے چاہا کہ اس کو اس گستاخی کی سزا دی جائے۔ کیونکہ صحابہ کو حضور صلعم سے بدکلامی نہایت ہی ناگوار گزری تھی چاہا کہ اس کا سر قلم کر دیں مگر آپؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ تمہیں تو اس کی حمایت کرنی چاہئے کیونکہ یہ حق پر ہے اور میں

اس کا مقروض ہوں اس کے بعد آپ صلعم نے اس کا قرض ادا کر دیا یہ وہ واقعہ ہے کہ جس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے عدل وانصاف کی وہ مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی بڑے قبیلے کی ایک معزز خاتون نے چوری کی اور حضور آپ کے سامنے پیش کیا گیا لوگوں نے عورت کے معزز ہونے کی وجہ سے اس کی سفارش کی کہ اسے معاف کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے اس کے جواب میں آپ صلعم نے وہ الفاظ ادا فرمائے جن پر عدل وانصاف کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی بھی یہ جرم کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹنے سے دریغ نہیں کرتا۔

آپ صلعم کا ارشاد ہے کہ عادل کو عدل کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ دیر سے ہونے والے فیصلے اپنی وقعت کھو دیتے ہیں اور اُن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا آپ صلعم نے لوگوں کو سختی سے ہدایت کی کہ انصاف کے معاملے میں کسی امیر وغریب بڑے یا چھوٹے کا کوئی امتیاز روا نہ رکھو بلکہ سب کو ایک نظر سے دیکھو۔

ہمارے سامنے حضور صلعم کا وہ عالی شان خطبہ بھی موجود ہے کہ جس میں آپ صلعم نے فرمایا تھا کہ قاتل ہی کو قتل کی سزا مل سکتی ہے اب نہ باپ کے بدلے بیٹا سزا پائے گا اور نہ بیٹے کے بدلے باپ کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا یعنی ہر ایک اپنے ایک جرم کا خود سزاوار ہوگا۔ ایک دفعہ کسی نے ایک لڑکے کو قتل کر دیا مقتول کا باپ آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا قاتل کا لڑکا میرے حوالے کیا جائے تاکہ میں اس کو قتل کر کے اپنے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچا سکوں۔ آپؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ قتل کی سزا قاتل ہی کو ملے گی نہ کہ قاتل کے بیٹے کو

ایک دفعہ ایک عیسائی نے دوسرے عیسائی کو قتل کر دیا حضور صلعم نے قتل کا فیصلہ سنانے سے قبل اس کے اعزاء واقرباء سے دریافت فرمایا کہ فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے یا اُن کے مذہب کے مطابق جواب میں انھوں نے عیسائی مذہب کے مطابق فیصلہ چاہا۔ آپ نے قاتل کو سزائے موت سنا دی کیوں کہ عیسائی مذہب میں قتل کی سزا، سزائے موت ہے۔ اس سے آپ کی سارے علوم پر دسترس ظاہر ہوتی ایک مرتبہ ایک معمولی حیثیت کے غیر مسلم نے ایک معروف مسلمان کے بارے میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس نے میری عزیزہ کو زبردستی قبضے میں رکھا ہوا ہے اور اب اسے واپس نہیں دیتا تو آپ نے فوراً عورت کو برآمد کرایا اور اس کے حوالے کر دیا اس واقعے سے بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان انصاف کا ہر تقاضا پورا ہوتا نظر آتا ہے ان تمام واقعات سے یہ بات سامنے

آتی ہے آنحضرت صلعم قانون بنانے اور عمل کرنے میں کسی بھی قسم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھتے تھے۔ حضور صلعم نے جب حضرت علی کو یمن کا جج مقرر کیا تو حضرت علیؓ کو تامل ہوا۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ میں اتنی کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری کیسے نبھاؤں گا تو آپؐ نے دعائیہ کلمات فرمائے اور کہا اللہ تم کو اپنی ہدایت سے نوازے گا اور تمہارے دل کو اس قدر وسیع اور پُر نور کر دے گا کہ تم صحیح فیصلے کرو گے اور پھر آپؐ نے نصیحت والے انداز میں فرمایا کہ اے علی! یاد رکھنا فیصلہ کرنے میں جلد بازی نہ کرنا جب تک کہ معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤ یعنی معاملے کے سارے پہلو تمہارے سامنے نہ آجائیں۔ تم جو بھی فیصلہ دو الجھا ہوا نہ ہو صاف اور واضح ہو سمجھ میں آنے والا ہو۔ خود حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ ان ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے کسی بھی بڑے سے بڑے معاملے میں فیصلہ دینے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ آپ صلعم نے فرمایا کہ انصاف کی کوئی قیمت نہیں یعنی ہر شخص کو انصاف بلا قیمت ملنا چاہئے۔ غرض کہ حضور صلعم کی ساری زندگی عدل وانصاف کے عظیم کارناموں سے بھری نظر آتی ہے۔

مسلّم صداقتوں کا پرتو۔

وہ وقت دور نہیں کہ جب قرآنِ کریم اپنی مسلّم صداقتوں اور روحانی کرشموں سے سب کو اپنے اندر جذب کرے گا۔ وہ زمانہ بھی دور نہیں کہ جب اسلام ہند و مذہب پر غالب آجائے گا اور ہندوستان میں ایک ہی مذہب ہوگا اور وہ اسلام ہوگا۔

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور)

فلسفۂ توحید میں بے نظیر

قرآن وحدانیت کا سب سے بڑا گواہ ہے اور ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ غرض سارے جہان میں قرآن کی نظیر نہیں ملتی۔

(نامور مؤرخ۔ ڈاکٹر گبن)

لاثانی نظامِ مسرت

مجھے اُمید ہے کہ میں دنیا کے تمام دانا اور باشعور لوگوں کو یکجا کر کے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک لاثانی نظام قائم کروں گا۔ کیوں کہ قرآن کی ہی تعلیمات انسانوں کو مسرتوں سے روشناس کر سکتی ہے۔

اقتباس تقریر نپولین از کتاب بوناپارٹ اور اسلام صفحہ ۱۰۵

(مصنف شیر فلس)

معلّمِ جہاد و ہمدردی

قرآن نے مسلمانوں کو جنگ (جہاد) بھی سکھائی، اور ہمدردی، فیاضی اور خیرات کرنا بھی سکھایا۔

(مسٹر آرنلڈ وہائٹ)

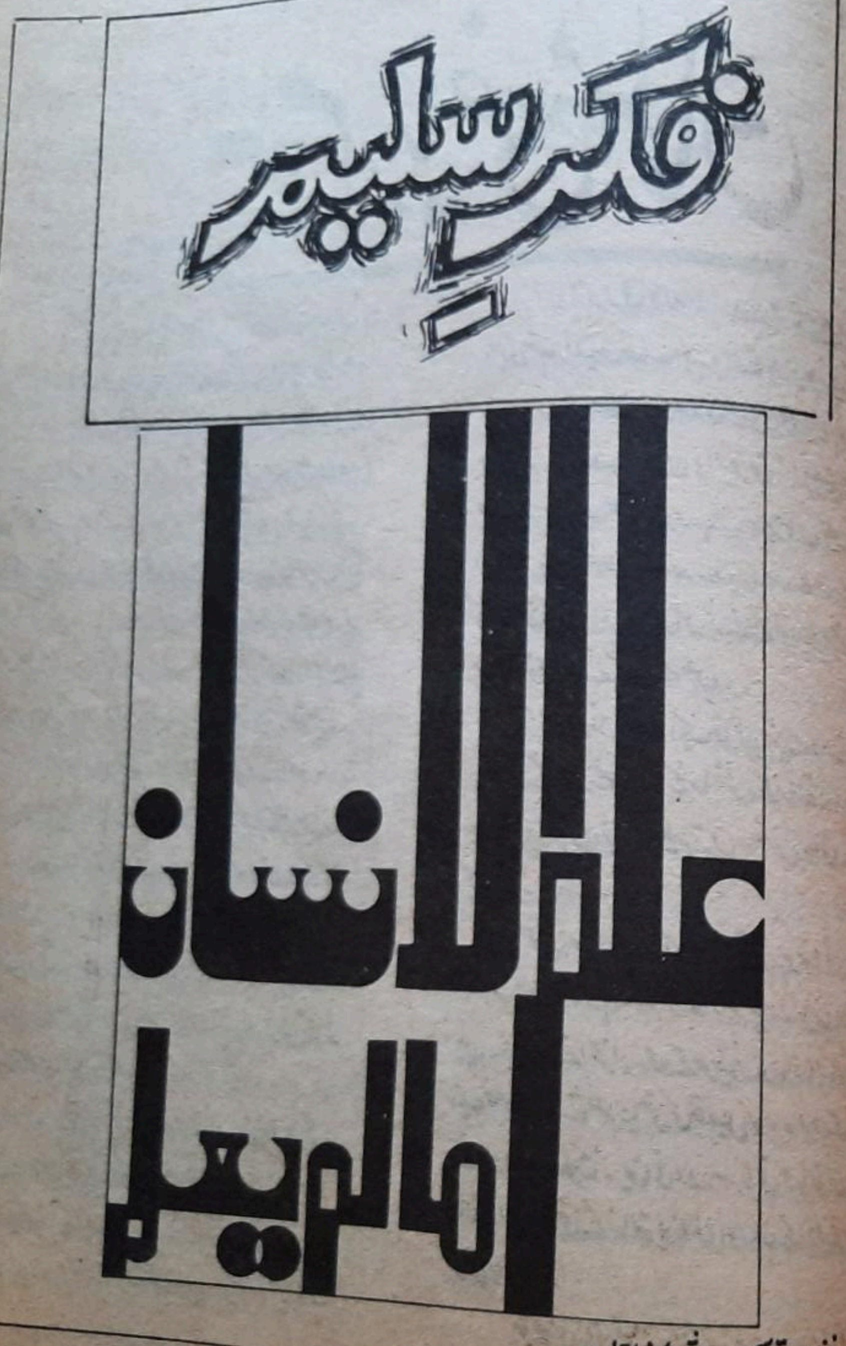

پروفیسر نظیر احمد قاسمی   شعبۂ نباتیات

اعجاز احمد، بی ایس سی، سال اول

علومِ ریاضی اور مسلمان

پروفیسر ایاز الدین
صدر شعبہ ریاضی
گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد

علمِ ریاضی کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا یونان میں تقریباً چھ ہزار سال قبل ہوئی پھر یہ علم روم تک پہونچا۔ روم کی تباہی کے ایک ہزار سال بعد تک یہ مکمل عدم توجہی کا شکار رہا۔ یہاں تک کہ آٹھویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے اس کے احیا کا کام منظم طور پر شروع کیا۔ اگلی دو صدیاں ریاضی میں علمی سرگرمیوں کے باب میں عروج کا زمانہ کہی جاسکتی ہیں۔ ریاضی میں علمی سرمائے کا ترجمہ عربی سے یورپی زبانوں میں ہوا۔ اور اسطرح مسلمان علوم ریاضی کے میدان میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک اہم کڑی کا درجہ رکھتے ہیں۔

علم الاعداد میں مسلمانوں کے کام کی بدولت انھیں روز مرہ حساب کا موجد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ الجبرا کے علم میں اضافہ کرنا اور اسے ایک باقاعدہ علم کا درجہ دینا مسلمانوں ہی کا کام ہے۔ انھوں نے جیومیٹری کی اس شاخ کی بنیاد رکھی جس میں مسائل کو الجبرائی طریقوں سے حل کیا جاتا ہے اور ہموار اور کروی مثلثات کے علم تو یونان میں تھے ہی نہیں، مسلمانوں کو مکمل طور پر ان کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

یورپ نے علمِ ریاضی میں مسلمانوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کچھ معروف اصطلاحات اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً عربی کے الجبر والمقابلہ سے الجبرا، صفر سے زیرو (ZERO) اور علم الاعداد میں محمد موسیٰ الخوارزمی کے نام پر لوگارتھم (Logarithm)

الخوارزمی کا زمانہ ۷۸۰ء تا ۸۵۰ء رہا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "حساب الجبر والمقابلہ" یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک رائج رہی ہے اور ایک اور تصنیف "الجمع والتفریق" لاطینی ترجمے کے صورت میں اب بھی موجود ہے۔ ہندسوں میں صفر کا اضافہ، الجبرا میں ضرب و تقسیم کے قاعدے، دوسرے درجے کی مساوات کی چھ اقسام بتانا اور انھیں حل کرنے کے قواعد وضع کرنا، یہ سب الخوارزمی کے کارنامے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ ایک قابلِ ہیئت داں اور علم جغرافیہ کے ماہر تھے۔ تاریخ سائنس کے مصنف سارٹن نے بجا طور پر انہیں دنیا کے عظیم ترین سائنس دانوں میں شمار کیا ہے۔

نویں صدی عیسوی کا اوّل تین چوتھائی، یہ زمانہ یعقوب الکندی کا ہے۔ علم الاعداد پر چار کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ انھوں نے الخوارزمی کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ ایک فلسفی کے لئے علم ریاضی کی تحصیل کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ وہ سنسکرت۔ یونانی اور سریانی زبانوں سے واقف اور ریاضی کے ساتھ یونانی اور ہندی فلسفے اور طب کے بھی عالم تھے۔

بنو موسیٰ نامی تین بھائی جیومیٹری میں قابلِ ذکر کام کر چکے ہیں۔ ہموار اور کروی سطحوں کی پیمائش کے بارے

میں ان کی ایک کتاب کا ترجمہ لاطینی میں بھی ہوا ہے۔ ثابت بن قرۃ جیومیٹری کے غالباً سب سے بڑے عرب ماہر تھے۔ ان کا ایک عظیم کارنامہ اپولونیس کی اس موضوع پر آٹھ میں سے سات کتابوں کی عربی میں منتقلی ہے۔ اس کام میں بنو موسیٰ نے ثابت کا ہاتھ بٹایا۔ ثابت نے اسحاق بن حنین کے کئے ہوئے اقلیدس کی دو کتابوں کے ترجموں کی اصلاح بھی کی ہے۔ اور اپنے وقت کے تمام سائنسی موضوعات پر انھوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔

ابو الوفا ایک ماہر فلکیات تھے۔ علم مثلثات پر انھوں نے اعلیٰ معیار کا کام کیا ہے۔ وہ جیومیٹری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اور الجبرا کے موضوع پر بعض کتابوں کے ترجمے انہوں نے کئے ہیں۔

عمر بن ابراہیم الخیامی (عمر خیام) کو ان کی رباعیات کی وجہ سے کون نہیں جانتا۔ الجبرا اور جیومیٹری کی تاریخ کے باب میں ان کی حیثیت کچھ کم نہیں۔ استدلال کی قوت اور گہرائی ان کی تحریروں کا خاصہ ہیں۔ خیام کا الجبرا ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے الخوارزمی کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

مسائل، ممکن اور ناممکن حل اور حل کی حدود پر بحث کرتے ہوئے خیام اپنے یونانی پیش روؤں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

تیسرے درجے کی مساوات کے حل کے لئے جیومیٹری کا استعمال خیام نے اس باقاعدہ اور منظم طریقہ سے کیا ہے کہ آج بھی ان کا یہ کام الجبراء کے طلباء کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نصیر الدین طوسی منگولوں کے حملے کے دور میں ایک ماہرِ فلکیات رہے ہیں۔ انھوں نے علم مثلثات پر نظرِ ثانی کی اور ان کی مرتب کردہ کئی کتابوں میں مسلم دور کے سائنسی علم کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ کروی مثلثات پر ان کی اپنی اعلیٰ درجہ کی تصنیف بھی ہے۔

اس دور کے بعد کلاسیکی ریاضی میں خصوصاً اس درجے کا کام پھر نہ ہوسکا۔ جیسا کہ الخوارزمی اور عمر خیام جیسے ماہر ریاضی داں کر گئے تھے۔

اس مختصر مضمون میں جمع کئے گئے حقائق کا مقصد اس طرف توجہ مبذول کرانا ہے کہ علم ریاضی کے میدان میں یہ اہم کارنامے اس وقت سر انجام پاتے ہیں۔ جب ابلاغ کی ان سہولتوں کا تصور بھی نہ تھا جو آج ہمیں میسر ہیں۔ اس کے باوجود جس نسا ندر پیمانے پر اتنا علمی کام ہو سکا اس کی بڑی وجہ غالباً اسلاف کا یہ تصور تھا کہ فکر و تدبر اور تسخیر کائنات کی کوششیں ایک مسلمان کے لئے احکام الٰہی میں شامل ہیں۔ اور احکام الٰہی سے روگردانی سے نہ فلاحِ آخرت ممکن ہے نہ فلاحِ دنیا۔

عقل و حکمت کے مطابق

قرآن کے احکام اس قدر عقل و حکمت کے مطابق واقع ہوئے ہیں کہ اگر انسان انہیں چشمِ بصیرت سے دیکھے تو وہ ایک پاکیزہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ شریعت اسلامی اعلیٰ درجے کے عقلی احکام کا مجموعہ ہے۔ میرے نزدیک قرآن کے تمام معانی میں سچائی کا جوہر موجود ہے۔ یہ کتاب سب سے اوّل اور سب سے آخر جو خوبیاں ہوسکتی ہیں اپنے اندر رکھتی ہے بلکہ در اصل ہر قسم کی توصیف اسی سے ہوسکتی ہے

(نامور انگریز پروفیسر کارلائل)

اسلامی معاشرہ

سید وسیم الحسن — انٹربا ٹیلوجی

علم معاشرت تہذیب طرز فکر اور طرز عمل کا مجموعہ ہے ہماری یہ سرزمین جو کبھی دنیا کی سب سے بڑی سرزمین تھی اور جو اسلامی روایات اور اصولوں کی گہوارہ سمجھی جاتی تھی۔ آج اپنی تہذیب وتمدن، مذہب اور روحانی روایات کو فراموش کر کے یورپی تہذیب کے شکنجے میں جا پھنسی ہے آج ہم اس دوراہے پر کھڑے ہیں جس پر تباہی وبربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے دنیا کی عظیم قوم مسلمان جس نے دنیا کے تمام علاقوں پر حکومت کی اور اسلام کا بول بالا کیا اپنے زمانوں میں اسلام کا سکہ بٹھا دیا۔

لیکن جہاں جہاں مسلمان اسلام کی روایات اور تہذیب وتمدن کو بھلاتے چلے گئے۔ وہاں اللہ نے قہر نازل فرمایا اور دوسری قوموں کو اس پر مسلط کر دیا۔

اس برصغیر جس پر ہزاروں سال سے مسلمانوں نے حکومت کی اور کر رہے ہیں اُس زمانے میں ہی اسلامی روایات کی بنیادیں گم ہو کر کمزور ہوتی گئیں۔ جب بہادر شاہ ظفر ہندوستان میں تخت نشین ہوئے جو اپنے محل اور اپنی ذات تک ہی محدود ہو گئے تھے اور جنکا حکم صرف محل کے اندر چلتا تھا۔ لیکن افسوس ان کو بھی اس وقت ہوش آیا جب اللہ نے عذاب نازل فرمایا اور سات سمندر پار انگریزوں کو ان پر مسلط کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سر سید احمد خان، چوہدری رحمت علی اور بہت سی ایسی ہی مشہور شخصیات تھیں جنھوں نے اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر اسلام کا پیغام پھیلایا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا۔ یہ ان ہی کی کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت وجود میں آیا۔ اس کے باوجود بھارتی رہنماؤں کی آنکھیں ہمارے ملک پر جمی ہوئی تھیں اور جمی ہوئی ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ پاکستان پر بھی قبضہ کر کے اسکو بھارت سے ملا دیا جائے، جسکا اظہار وہ مختلف محاذوں پر کر چکے ہیں۔

ہم مسلمان ہیں مگر غیر مسلموں سے بھی بدتر اور کمتر ہیں یہ سرزمین اور اس پر رہنے والے مسلمان آہستہ آہستہ اپنے جیالوں، بہادروں، اور دلیروں اور سب سے بڑھ کر اپنی اسلامی تعلیمات کو بھلا کر یورپی تہذیب اپنا رہے ہیں اور اپنی تباہی کی راہ خود ہموار کر رہے ہیں۔

ایک طرف ہم خود فیشن کی مخالفت کرتے ہیں اور دوسری طرف فیشن کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یورپی ممالک میں ایک کثیر رقم مسلمان نوجوان ملک کو بگاڑنے انکو گمراہ کرنے اور ان کو اپنی تہذیب سے دور کرنے کے لئے خرچ کی جاتی ہے۔ مثلاً آپ میک اپ کا سامان ہی لے لیں آج باہر کے ممالک سے میک اپ کا سامان اتنا درآمد کیا جا رہا ہے جتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ جدید یورپی تہذیب کا یہی سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس نے عورت کی نسوانیت اور چار دیواری چھڑا کر اسکو بازاروں کی زینت بنا دیا۔

یورپ بذات خود بُرا نہیں اس نے پوری دنیا کو علم سے منور کیا مگر افسوس! ہم اسکی غلط پالیسیوں کو اپنا رہے ہیں تصویر کا تاریک پہلو دیکھ رہے ہیں۔ مگر اس کا روشن پہلو دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ یورپی عوام اپنے اچھے اور برے کی تمیز خوب کرتے ہیں ان میں جذبۂ خدمت ملک موجود ہے وہ وقت کے ایسے پابند ہیں کہ روئے زمین پر ان کی مثال نہیں ملتی۔ شاید ایمانداری، انسانی ہمدردی اور وقت کی پابندی ہی ان کی کامیابی کی سب سے روشن دلیل ہے

ہمارے آباؤ اجداد جن میں محمد بن قاسم، خالد بن ولید اور طارق بن زیاد کے نام سرفہرست ہیں۔ کیا ہم ان کی عظیم اور سنہری روایات کو قائم رکھ سکیں گے۔ اور آنے والی نسلوں تک پہنچا سکیں گے تو جواب ہمیں نفی میں ملے گا۔ مثلاً اگر ہم کسی بچے سے یہ پوچھیں کہ آجکل کونسا فلمی اداکار مشہور ہے تو وہ فوراً امیتابھ بچن کا نام لے گا۔ اور اگر کسی بچے سے ہم یہ دریافت کریں کہ پاکستان کا نام کس نے رکھا تو شائد ہی کوئی بچہ بتا سکے۔ اس سے ہم خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب کی روایات کو کس طرح آنے والی نسلوں تک پہنچا سکیں گے۔

دنیا کی کوئی قوم یا ملک ایسا نہیں جس پر اللہ کی آزمائش نہ پڑی ہو۔ یہ دنیا آزمائشوں کا گہوارہ ہے اب ہم پر بھی آزمائش کا وقت آپڑا ہے۔ جگہ جگہ علاقائی تعصبات پر جھگڑے اور فساد ہو رہے ہیں۔ ایک صوبے والے دوسرے صوبے والے کے دشمن ہوتے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے ذہنوں میں یہ سمایا ہوا ہے کہ جو شخص جہاں رہتا ہے تو ہم فوراً اس کو اس اسکو اس کے صوبے کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ لیکن! اگر ہم قرآنی یا اسلامی تعلیمات پر غور کریں تو ہمیں یہ حکم ہے کہ کوئی شخص کسی شخص پر فضیلت نہیں رکھتا۔ امیر، غریب بادشاہ، فقیر، کالے گورے سب کا ایک خدا ہے، ایک نبی ہے اور ایک کتاب ہے کوئی کسی پر فضیلت نہیں رکھتا۔ سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

آج جب ہم اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے تو ہم صرف نام کے مسلمان ہیں۔ صرف کلمہ پڑھ لینا مسلمان ہونے کی دلیل نہیں۔ بلکہ اللہ اور اسکے رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور دوسروں کو اسکی تلقین کرنے کا نام مسلمان ہے۔ چھوٹی سی یہی بات لے لیں کہ ہم ہفتہ میں کتنی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہی سرخرو نظر آئیں گے۔ باقی سب پشیمان ہونگے۔ اس کے برعکس اگر ہم ایک غیر مسلم کو لے لیں تو وہ بھی ہفتہ میں ایک بار گرجا میں جا کر اپنے جھوٹے خداؤں سے توبہ کر آتا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم کس طرح اور کس بات کے مسلمان ہیں۔

آج معاشرے میں خدمت خلق اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنے کے برخلاف ہم لوگ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں پر فضیلت دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کے خلاف غلط پروپگنڈے کر رہے ہیں۔ کس لئے؟ صرف صوبائی لحاظ سے کہ یہ مہاجر ہے یہ سندھی ہے۔ یہ پنجابی ہے اور یہ پٹھان ہے۔ شاید ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے وہ نکات بھول گئے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "کسی عربی کو کسی عجمی پر کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت نہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں۔ صرف انسان کی نیکی ہی اسے دوسروں سے برتر

بناتی ہے۔

اگر ہم ان نکات کو بھلا کر اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے تعصب رکھیں تو اسکا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی اور اسکے برخلاف عمل کر رہے ہیں۔ تو ہم مسلمان نہیں ہوسکتے، بظاہر تو مسلمان ہونگے لیکن اندرونی لحاظ سے ہم کافر سے بھی بدتر ہونگے۔

عزیز طالب علم ساتھیو!

اگر ہمیں اپنے ملک کو ترقی دینی ہے اسکو مضبوط اور دائم رکھنا ہے اور اپنی آنے والی نسلوں کو اس پاک اور آزاد سرزمین پر رکھنا ہے اور اس ملک کو اسلام کا مضبوط قلعہ بنانا ہے تو ہمیں اپنے سیاسی و اجتماعی تمام تر توقعات کو اپنے ذہنوں سے نکال دینا چاہیئے اور اپنی زندگی کو کتاب و سنت کی روشنی میں اسکے مطابق ڈھالنا چاہیئے اگر ہم یہ نہ کرسکیں گے تو ہم روز بروز گہرائی کی طرف گرتے چلے جائیں گے، اور اپنا ملک اپنی زمین اور اپنی تہذیب سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔

موتی

ڈرو	صرف خدا سے
لڑو	صرف برائی سے
مرو	صرف اللہ کی راہ میں
کرو	صرف نیک کام
چلو	صرف سیدھی راہ پر
ہنسو	صرف اچھے کام پر
بڑھو	صرف نیکی کی طرف
آؤ	صرف اللہ کی طرف
سناؤ	صرف اچھی بات
بتاؤ	صرف اچھی بات

آسمانی کتب پر فائق

قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔

(فرانسیسی ڈاکٹر مورس)

زندۂ جاوید تعلیمات

تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیمات کا اثر ہے کہ ایک خاکروب بھی مسلمان ہو کر بڑے بڑے خاندانی مسلمانوں کی برابری کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

(مسٹر بھوپندر ناتھ باشو)

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

معراج حسین صدیقی
بی اے سال دوم

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ع :- اس مصرعے کا مفہوم واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پورے شعر کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اقبال نے یوں فرمایا ہے کہ

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر دین کو سیاست سے الگ کردیا جائے تو سیاست ظلم و ستم اور مکر و فریب کا اکھاڑہ بن کر رہ جاتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں فساد اور بگاڑ اپنا ڈیرہ جما لیتا ہے، بے ایمانی، لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی، بے غیرتی اور بے حیائی اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ سیاست کو دین سے الگ کردینے کا نتیجہ ہے کیونکہ جب سیاست کا غلط مفہوم عوام الناس کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو صالح اور نیک لوگ سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر کنارہ کش رہتے ہیں اور سیاست کی باگ ڈور فاسق و فاجر لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ جن کے غلط اعمال سے مملکت کی پوری فضا مسموم ہو کر رہ جاتی ہے اور ہر طرف شیطانیت کا پرچار ہوتا ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دین و سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے جس کا ثبوت کلام پاک کی یہ آیتِ کریمہ ہے۔

ترجمہ:- وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ سارے ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سیاست دین کا ایک اہم جزو ہے اس فرمانِ الٰہی سے یہ معلوم ہوا کہ ہم اس دین کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں اور اپنا نظامِ حکومت اسلام کے سنہری اور پاک اصولوں پر استوار کریں۔

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ محض دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح پوجا پاٹ ہی تک محدود نہیں ہے۔ اس ضابطۂ حیات کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے نفاذ کی واحد ضرورت سیاست ہے۔

سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد از ہجرت مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور دینِ اسلام کو عملاً نافذ کیا۔

سیاست کوئی معمولی اہمیت کی چیز نہیں ہے، انسانی زندگی کا کوئی معاملہ سیاست کے دائرے سے باہر نہیں ہے زندگی کے بناؤ اور بگاڑ پر سیاست کا اثر غیر معمولی ہے اور اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام رکھتا ہے۔ جبکہ سیاسی نظام

بھی ایک جزو ہے۔ ہم مسلمان اسی صورت میں رہ سکتے ہیں جبکہ قرآن کے تمام احکامات بجا لائیں۔ احکام شریعت کی تعمیل مسلمان پر لازم ہے۔ اور اس کی تکمیل کی واحد صورت دین کی سیاست سے وابستگی ہے۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ان کی سیاسی زندگی دین کے دائرہ میں شامل ہے۔ اور اسے اس کی حدود سے کسی طرح باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر باہر رکھا جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اقتدار حکومت کے بغیر دین کے بے شمار احکام معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور ان پر عمل کرنا یا کرانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی بھی جزو چھوڑ بیٹھنا کفر کی روش ہے

لہٰذا اس کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ سیاست اسلام کا ایک انتہائی ضروری جزو ہے جو اس حقیقت کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ وہ فہم دین سے عاری ہیں۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

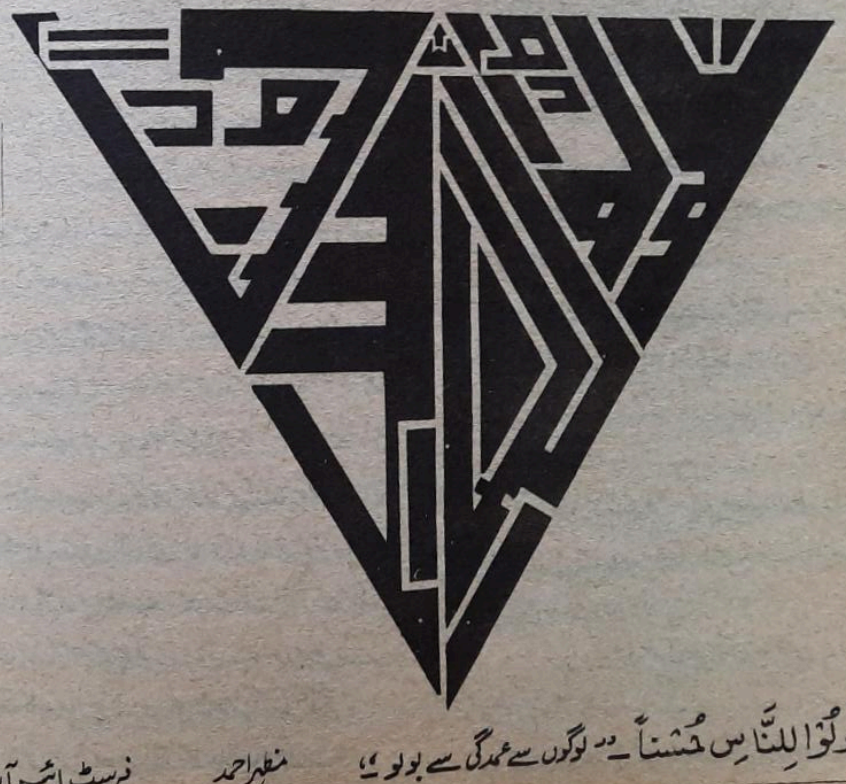

تُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۔ "لوگوں سے عمدگی سے بولو"

منظر احمد — فرسٹ ایئر آرٹس

عذرا اقبال

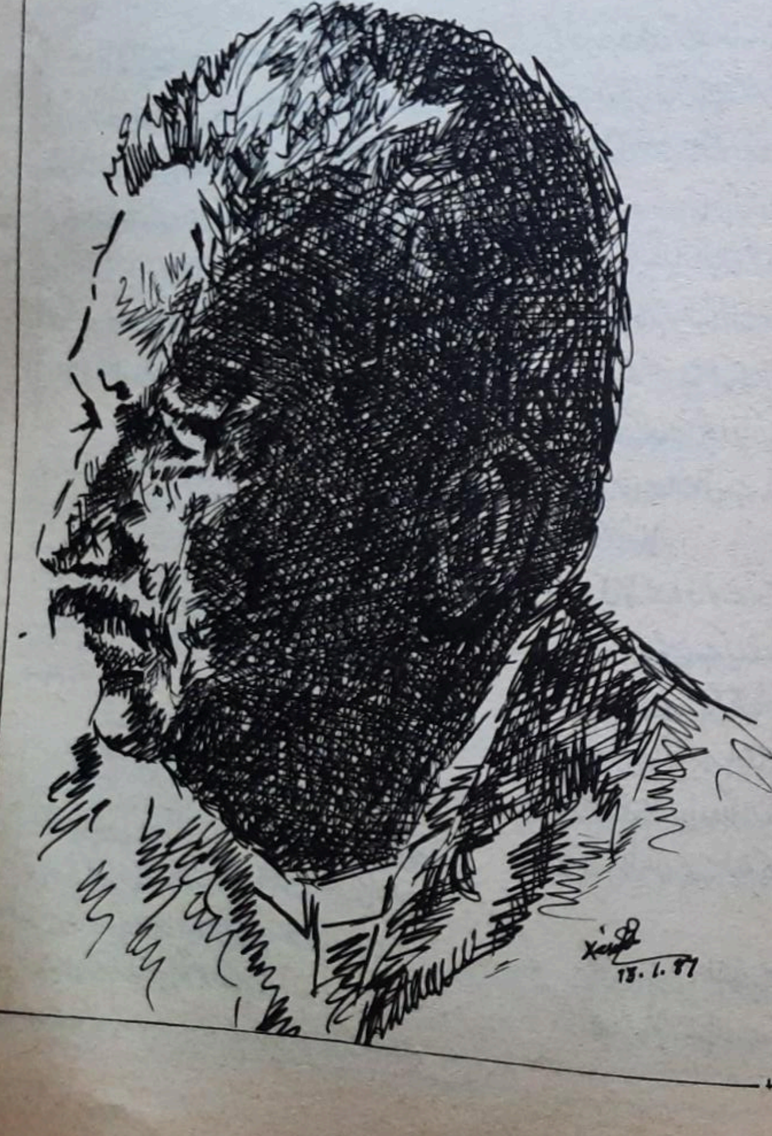

اقبال کی شاعری اور اسلامیانِ ہند

محمد عارف رندھاوا
انٹر بائیولوجی

آغازِ سخن:۔ شاعری اور نبوت اکتسابی چیز نہیں بلکہ یہ ایک اعزاز ہے جو اللہ اپنے خاص بندوں کو عنایت فرماتا ہے۔ جب کوئی قوم ذلت اور گمراہی کے گڑھوں میں گر جاتی ہے اور کفر و شرک سے ناطہ جوڑ کر بے دینی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کھا کر ان کی فلاح کے لیے نبی یا رسول بھیج دیتا ہے جو اس قوم کو امن اور سلامتی کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی قوم اخلاق سے تہی دامن ہو جائے اور انسانی اقدار کی پامالی کو اپنا شعار بنائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم میں ایسا شخص پیدا کرتا ہے جو شاعر یا ادیب کی صورت میں نمودار ہو کر قوم کو اخلاقیات کا درس دیتا ہے اور اس قوم کی سوئی ہوئی غیرت و حمیت کو بیدار کر دیتا ہے۔

انیسویں صدی میں مسلمانانِ عالم عموماً اور اسلامیانِ ہند خصوصاً مذہبی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مملکتِ اسلامیہ کا چراغ گل ہو چکا تھا اور برطانوی حکمران مسلم قوم کو اپنے اقتدار کا سب سے بڑا خطرہ سمجھ کر مسلم قوم کے دل میں اسلام کی محبت ختم کرنے پر تلا ہوا تھا اور مسلمان اپنی انفرادیت احساسِ فرض اور جذبۂ حریت کو فراموش کر کے غلامی کے قعرِ مذلت میں گر چکا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے حالی، اور پھر اقبال جیسے شخص کو پیدا کیا۔ جنھوں نے اسلامیانِ ہند کو ان کی حالتِ زار کا احساس دلایا اور ان میں مسلم قومیت کے جذبہ کو ابھارا۔ اقبال کی آواز نے مسلمانوں میں جوشِ عمل اور عزم و یقین پیدا کیا۔ اقبال نے دورانِ تعلیم ان تمام مسائل کا مطالعہ کیا جو مسلمانانِ عالم کو عموماً اور اسلامیانِ ہند کو خصوصاً درپیش تھے۔ آپ نے امتِ مسلمہ کے ماضی اور موجودہ زوال کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں کی اس حالت کی اصل وجہ اسلام سے لاتعلقی ہے۔ اسی لیے اقبال نے اللہ کا یہ پیغام مسلمانوں کو سنایا۔

؎ کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ ایک شعر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا علاج ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر ان کی توجہ موجودہ حالتِ زار کی طرف مبذول کرائی اور کچھ اسطرح کے اشعار کہے۔

؎ کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

؎ کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

استبدادِ زمانہ نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر کاہلی اور تقدیر پر قانع ہو جانے کے جو جذبات مسلط کر دیے تھے اقبال نے مسلمانوں کے از... بات کو ختم کرنے کے لیے ان میں تحریک پیدا کی اور ان کے جوشِ عمل کو ابھارا۔ آپ نے مسلمان قوم کو ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جو انتہائی نڈر، بے خوف اور جوشِ عمل کے جذبے سے بھرپور ہے۔ آپ کے نزدیک شاہین کی صفات ہی مومن کی صفات ہیں۔ آپ نے کئی اشعار میں ان صفات کا ذکر کیا جو شاہین میں موجود ہیں وہی اوصاف مسلمانوں میں بھی موجود ہونے چاہیئیں۔ مثلاً

؎ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

؎ نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ڈاکٹر اقبال نے مسلمانوں میں جذبۂ خودداری کو پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ آپ نے خودداری کا ذکر اسطرح کیا۔

؎ یہ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

خودداری کے اس جذبہ نے بعد میں فلسفۂ خودی کی شکل اختیار کر لی۔ اقبال کے خودی سے متعلق کئی اشعار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی ہو بہو عبارت ہیں مثلاً اقبال کا یہ شعر۔

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

حضورؐ کے اس قول سے عبارت ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ عَرَفَ رَبَّہٗ" کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔ یا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (یعنی فقر میرا فخر ہے) پر اقبال نے کہا۔

؎ مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

فلسفۂ خودی کے متعلق اقبال کا اپنا نظریہ تو یہ ہے کہ

؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال کے نزدیک اس شخص کا مرتبہ بہت بلند ہے جو میدانِ عمل میں جدوجہد کرتا ہے بمقابلہ اُس کے جو مدرسہ میں بیٹھ کر علم اور فلسفہ کی باتیں کرتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ شعر کہا۔

؎ ہے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

غرض یہ کہ ڈاکٹر اقبال نے ہند کے مسلمانوں میں نہ صرف یہ کہ خودداری، خودی اور جذبۂ جہاد پیدا کیا بلکہ انہیں منزل کی بھی نشان دہی کر دی اور اسلامیانِ ہند کیلئے ایک علیحدہ مملکت پاکستان کا تصور پیش کیا اور آج ہم اقبال کے اس احسانِ عظیم کو بجائے اُن کے اقوال پر عمل کرنے کے ہفتۂ اقبال منا کر اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم کو پاکستان کے محسنوں کا احسان مند ہونا چاہیے جن کی کوشش سے ہم ایک آزاد مملکتِ خداداد پاکستان میں سانس لے رہے ہیں۔

اقبال اور مردِ مومن

تحریر:- مسعود علیخان
بی۔ ایس۔ سی سال دوئم

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

مومن بندہ ہر خوف و خطر اور ظاہر داری سے بے نیاز ہوتا ہے۔ خواہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو وہ باطل کے سامنے نہیں جھکتا، بلکہ مصیبت اور دشواری کو خوشی خوشی جھیل جاتا ہے۔

مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں خدا کی وحدانیت کا قائل ہو اور اس کے احکامات کو عملی طور پر پورا کرکے مخلوق کے سامنے نمونہ پیش کرے اور جو شخص اس سے روگردانی کرے وہ یقیناً مومن کہلانے کا حقدار نہیں ہو سکتا خواہ وہ کتنے ہی بڑے مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ دراصل مسلمان ہونا کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ بڑی خوبی باعمل "بندۂ مومن" ہونا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ وہ مومن بندے جو واقعی اس کے مستحق تھے وہ وہ کارنامے انجام دے گئے جس پر آج کی ترقی یافتہ دنیا حیران ہے۔ باوجودیکہ اُن پر طرح طرح کے مصائب ڈالے گئے، اُن کو ستایا گیا، تہمتیں لگائی گئیں۔ لیکن وہ باز نہیں آئے۔ بلکہ صراطِ مستقیم کی راہ پر گامزن رہے اور اسی وہ عملی طور پر مومن کا صحیح نمونہ پیش کر گئے۔ کاش ہم اس پر چلنے کی کوشش کریں۔

امام ابو حنیفہؒ کا واقعہ حق و باطل کی کشمکش پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ بظاہر صرف خلیفہ سے تھوڑا سا شرعی اختلاف تھا۔ لیکن وہ حق کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ لہٰذا اُنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ جس پر اُن کو زنداں میں ڈلوایا گیا لیکن انہوں نے بجائے خلیفۂ وقت کے سامنے جھکنے کے زنداں کو ترجیح دی۔

اُنھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو خلیفہ سے اتفاق کرکے دُنیا کی تمام آسائشیں حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن وہ چند روزہ دُنیا پر آخرت کو قربان کرنے کو تیار نہ ہوتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک روز بہر حال معبودِ حقیقی کے روبرو ہونا ہے اور

باقی صفحہ نمبر ۱۰۶ پر

نظریۂ پاکستان

محمد عظیم گل
بی، اے سال اوّل

پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جو ایک خاص نظریے کے تحت معرضِ وجود میں آیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ مسلمانانِ برصغیر کا نصب العین متعین ہو چکا تھا اور انہیں اپنی منزلِ مقصود قریب نظر آنے لگی تھی۔

پاکستان کی تشکیل صرف ایک مسلم قومیت کے تصور سے ہوئی ہے اس لئے مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت سے ملک کی تخلیق کا اصول ہی فراہم نہیں کیا۔ اس کی شکل بھی متعین کی شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل اس کا جغرافیہ بھی ہمیں دیا۔ اس وجہ سے پاکستان کا وجود ایک مسلم قومیت کا مرہونِ منت ہے اور اس کی بقاء کا دارومدار بھی اسی تصورِ قومیت پر ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہماری جدوجہد آزادی دنیا کے دوسرے ممالک کی آزادی سے قطعی مختلف ہونے کے علاوہ تاریخی بھی ہے۔

غازی محمد بن قاسم نے جو ایک سترہ سالہ نوجوان تھا سب سے پہلے ۷۱۲ء میں یہاں آکر اسلام کی داغ بیل ڈالی۔ اس سپہ سالار کی آمد سے پہلے یہاں دو بڑے مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ ہندومت اور جین مت۔ جب اس برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو ان دونوں مذاہب نے اسلام کو بھی مدغم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسلام چونکہ ایک لافانی اور افضل دین ہے لہٰذا ایسا نہ ہو سکا۔ اسلام نے ایک تبلیغی مذہب ہونے کی وجہ سے اپنے اثرات مقامی لوگوں پر اس طرح قائم کئے کہ وہ جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ غازی محمد بن قاسم کے بعد بھی وقتاً فوقتاً فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ برصغیر پر مسلمانوں کی لگاتار ایک ہزار سال تک حکومت رہی لیکن ہندوؤں نے کبھی بھی مسلمانوں کی طرف تعاون کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ نہایت متعصب اور مکار ہونے کے علاوہ تنگ نظر بھی تھے لہٰذا اتنی مدت ساتھ رہنے کے باوجود مسلمانوں اور ہندوؤں کی دورنگی باقی رہی۔ دوسری طرف مسلمانوں میں بوجوہ ایک دوسرے سے بیگانگی نے زور پکڑا جس کی وجہ سے ان میں نفاق اور انتشار پیدا ہو گیا۔ اور بالآخر سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان بری طرح افراتفری کا شکار ہو گیا۔ اسی ہیجانی کیفیت نے ایک غیر قوم کو یہاں قدم جمانے کا موقع فراہم کیا جو تجارت کی غرض سے یہاں آئی اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے اقتدار کی مالک بن گئی۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر برصغیر میں مسلمانوں کا دوہری غلامی سے بچنا ضروری تھا۔ وہ بیک وقت دو خطرات سے

دوچار تھے اسی وجہ سے وہ آخر تک دو طرفہ ایسے دشمنوں کا ہدف بنے رہے جو مسلمانوں کے وجود کو اپنے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ اور ان سے کئی سطحوں پر صدیوں سے شدید منافرت اور مخالفت رکھتے تھے کیونکہ اسلام ایک بالکل جداگانہ نظامِ فکر و عمل کا نام ہے اور اس کی تہذیب، ثقافت اور تمدن کسی لحاظ سے بھی ان سے مشترک نہ تھا۔ مزید برآں ہندو اور انگریز دونوں احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ مسلمان ایک طرف ہندوؤں کی صدیوں پرانی نفرت کا نشانہ تھے، جو ہندوستان پر مسلمانوں کے سینکڑوں سالہ اقتدار سے وابستہ تھی اور دوسری طرف وہ انگریزوں کے تشدد کا ہدف تھے۔ اس لئے کہ انگریز صرف انہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ اس پیچیدہ صورتحال میں چند مسلمان لیڈروں کو اس سے نجات حاصل کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ تاکہ وہ اپنی قومی انفرادیت کو برقرار رکھ سکیں۔ ان مسلمان قائدین نے جن میں سر سید احمد خان علامہ اقبال اور قائداعظم پیش پیش تھے حصولِ مقصد کیلئے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا شروع کر دیا۔ سر سید احمد خان نے اپنی دوراندیشی سے یہ بھانپ لیا تھا کہ برصغیر کی تقسیم ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی بیداری میں گہری دلچسپی لی۔ علامہ اقبال اسلامی اصولوں پر کامل ایمان اور یقین محکم رکھتے تھے آپ نے ایک الگ ریاست کا سب سے پہلے تصور پیش کیا اور ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کیلئے ایک الگ خودمختار ملک ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اور ساتھ ہی مسلم حکومت کے قیام کے لئے متعلقہ علاقوں کا خاکہ بھی پیش کیا۔ اسی سال لندن میں ایک گول میز کانفرنس بھی ہوئی۔ لندن میں قیام کے دوران ان زعماء کی ملاقات ایک زیرِ تعلیم مسلم طالب علم چودھری رحمت علی سے ہوئی۔ جو وہاں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے انہوں نے ہی اس اسلامی ریاست کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نظریۂ پاکستان کے عظیم علمبردار تھے۔ انہوں نے نہایت لگن محنت اور دیانت داری سے اس جذبے کو ساحلِ مراد تک پہنچایا۔ اور اس طرح پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشہ پر ایک آزاد اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے نمودار ہوا۔

اس پس منظر کے پیشِ نظر وقت اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس نظریاتی اساس کو مستحکم بنائیں جس کیلئے ہماری قوم نے بیش قیمت قربانیاں دیں۔ جب تک ہم اس نظریئے پر کاربند رہے، دشمن ہمارا اقتصادی، سیاسی اور ۱۹۶۵ء کے جنگی محاذ تک پر کچھ نہ بگاڑ سکا۔ لیکن جب اس نے ہمارے مسلم قومیت کے نظریے پر وار کیا اور اسے کمزور کیا تو پاکستان کو جنگی لحاظ سے بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ تاریخی حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم صرف اسی وقت اپنا مؤثر دفاع کر سکتے ہیں۔ جب ہم اس نظریئے پر جس کی مقدس اساس لا الٰہ الا اللہ پر ہے پوری طرح کاربند ہوں۔

تحریک پاکستان میں طلباء کا کردار

محمد اشفاق عاصم
انٹر بائیلوجی

زندہ قوم اپنے محسنوں کو کبھی نہیں بھولتی ان کا مقام قوم کے دلوں میں متعین ہوتا ہے اور جن کی حکومت قوم کے دلوں پر ہو وہ مرنے کے بعد بھی قوم کے دلوں پر حکمران رہتے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں بارہا مختلف ادوار پیش آتے ہیں۔ قومیں کبھی سربلندی سے سرفراز ہوتی ہیں کبھی حادثہ زوال سے پامال۔ جہاں قوموں کو کبھی عروج و سرفرازی نصیب ہوتی ہے کہ زمانہ کامرانی اور شادمانی کا تاج ان کے قدموں میں پیش کر دیتا ہے تو کبھی ذلّت و نامرادی کی گہری کھائیاں ان کے آگے منہ کھولے کھڑی ہیں۔

برصغیر میں ایک ہزار برس تک قوم رسول ہاشمی حکمرانی کرتی رہی۔ جب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ جھلملانے لگا تو فرنگیوں نے اپنی مکارانہ چال سے برصغیر کے باشندوں میں پھوٹ ڈال دی جس سے مسلمان بھی نہ بچ سکے۔ مسلمان بچ بھی کیسے سکتے تھے اُن کا نشانہ بھی تو خاص کر مسلمان قوم تھی جو ان کے جارحانہ اقدامات میں مزاحم ہو سکتی تھی۔ انگریز کامیاب ہو گئے اور تمام سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تو مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

سویا ہوا شیر جاگا تو شکاری آن پہنچے انگریز اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے قانون اور آرڈیننس کے ہتھیار مکاریوں اور چالاکیوں کے ساتھ لیکر میدان میں اُتر آیا۔ ہندو اپنی صدیوں پرانی انتقامی آگ کو دبائے بیٹھا تھا اسے بھی موقع مل گیا اس کی تنگ نظری اور متعصبانہ سوچ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کے ہر موقع کو استعمال کیا۔ چاروں طرف مسلمانوں کیلئے سانس لینے تک کے مواقع ختم کئے جانے لگے۔ تعلیم، سیاست، معیشت، معاشرت یہاں تک کہ دین ہر محاذ پر مسلمانوں کا گھیراؤ کیا گیا۔ ہندو اور انگریز دونوں اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اخلاق و شرافت کے تمام اصولوں سے بیگانہ ہو گئے۔ مسلمان کیلئے مسلمان کے طور پر جینا محال ہو گیا۔ ان حالات کے پیش نظر برصغیر کے مسلم طلباء اٹھ کھڑے ہوئے جلد ہی برصغیر کے طول و عرض میں طلبہ کی تنظیمیں ظہور میں آنے لگیں اور بالآخر قائد اعظم کے ایماء پر آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس فیڈریشن کے قیام اور استحکام میں مسلم اکابرین نے رہنمائی فرمائی۔ قائد اعظم جانتے تھے کہ طلباء قیام پاکستان کے اہم اور عظیم ستون ہیں اس لئے وہ ہمیشہ طلباء سے ملاقات کیلئے وقت نکال لیتے جبکہ بعض اہم شخصیتوں سے ملاقات کا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ جب قائد اعظم نے مسلم عوام سے الیکشن فنڈ کیلئے چندہ کی اپیل کی تو اس کے جواب میں ملتِ اسلامیہ کے چھوٹے بڑے نے لبیک کہا اور طلبہ نے جس فراخدلی کا ثبوت دیا اس کی مثال ہماری ملی تاریخ کا سرمایہ ہے کہ طلبہ نے اپنے جیب خرچ اور وظائف کی پوری پوری رقمیں قائد کو عطیہ کے طور پر روانہ کیں۔ اپنے خون سے لکھے ہوئے خطوط قائد کو تحریر کئے کہ وہ حصولِ پاکستان میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے اور حقیقتاً انہوں نے اسے سچ کر دکھایا۔

طلبہ برادری کا یہ جذبہ بنگال، یو پی، سی پی، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان ہی میں نظر نہیں آیا بلکہ برصغیر کے باہر امریکہ، برطانیہ، چین، جاپان، لنکا، ملائشیا اور بہت سے ممالک جہاں جہاں مسلمان مقیم تھے قائد اعظم کی اپیل پر لبیک کہا گیا مثلاً کیمبرج کے ایک طالب علم چودھری رحمت علی نے ایک پمفلٹ NOW OR NEVER (ابھی یا کبھی نہیں) شائع کیا، پاکستان نیشنل موومنٹ کے نام سے تحریک شروع کی ہینڈ بل تقسیم کئے۔ ہفت روزہ پاکستان جاری کیا وغیرہ وغیرہ۔

مسلمانوں کی ملی اور سیاسی زندگی میں جب بھی کوئی نازک موڑ آیا، قائد اعظم نے مسلم طلباء کو یاد فرمایا۔ چنانچہ جب ۱۹۴۵ء میں ملک گیر انتخابات کے ذریعے اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنی قسمت ہندو کانگریس کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں یا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنا قومی تشخص برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو قائد اعظم کی نگاہِ انتخاب مسلم یونیورسٹی پر پڑی مگر وہ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہ جا سکے تاہم انہوں نے لیاقت علی خان کو علی گڑھ بھیجا جہاں انہوں نے قائد کا پیغام یونیورسٹی کے پُر ہجوم طلباء کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ وہ پیغام یہ ہے:

"میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ طالب علموں کو اپنی تعلیم قربان کر کے سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے مگر کبھی کبھی ایک قوم کی موت اور زندگی کا وقت آ جاتا ہے آج وہی وقت درپیش ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے اسکولوں اور کالجوں سے نکل آؤ خواہ تمہارا ایک سال ہی ضائع کیوں نہ ہو جائے آؤ انتخابات میں ہماری مدد کرو۔"

قائد کے اس پیغام نے طلباء علیگڑھ کے ملی احساسات میں ایک ایسی آگ لگا دی کہ انہوں نے ہندو سامراج اور انگریزی استعمار دونوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ علیگڑھ کے دو ہزار سے زائد طلباء نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا اور سروں سے کفن باندھ کر قائد کا پیغام پہنچانے کیلئے سندھ کے ریگزاروں سے لیکر صوبہ سرحد کی سنگلاخ چٹانوں تک کہیں اونٹوں پر تو کہیں پیدل ہزاروں میل چل کر سفر کیا اور برصغیر کے شہر شہر قریہ قریہ پہنچ کر مسلمانوں کو قائد کا پیغام پہنچانے میں تکالیف برداشت کیں نظریہ پاکستان کی تبلیغ میں انہیں کئی کئی دن بھوکے رہ کر بھی گزارا کرنا پڑا۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا یہی جذبہ دیکھ کر قائد اعظم نے تاریخ ساز شخصیتیں پیدا کرنے والی اس عظیم درسگاہ اور اس کے طلباء کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "علیگڑھ مسلم انڈیا کا اسلحہ خانہ ہے اور طلبہ اس کے سپاہی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ جذبہ ایثار کی یہ عظیم مثالیں صرف علیگڑھ یونیورسٹی نے ہی نہیں بلکہ برصغیر کی تمام مسلم درسگاہوں کے طلباء نے جن میں سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد، آسام، بنگال، بہار، دکن، اور گجرات شامل ہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن کا اعتراف ہمیشہ قائد نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔

پاکستان کے قیام میں جہاں مسلم تحریکوں، قائدین اور مجاہدین کی مساعی کا ذکر کیا جائے گا وہاں طلبہ کے کردار کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

"ن ۲۷۲۶۲ ۱۹۱ البقا" سیتا.

اُس روز مجھے جوابدہ ہونا ہے۔ کیا جواب دوں گا۔ لہٰذا وہ تمام دنیاوی تکالیف کو ہنسی خوشی جھیل گئے اور ہم کو خدا تک رسائی کا معقول ترین ذریعہ بتا گئے کہ حق پر قائم رہنے والے دنیاوی عزّت و حشمت کی کوئی وقعت نہیں سمجھتے اور اگر کوئی بڑی سے بڑی طاقت خواہ کوئی بھی ہو اُن کو اس سے متزلزل کرے تو وہ بجائے خوف کھانے کے اس کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں لیکن حق کا باقی رکھتے ہیں۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، جناب حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اور مولانا اسماعیل شہید رح کے واقعات اس سلسلے میں ہمارے متزلزل ارادوں کو نئی روشنی بخشتے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دراصل بندۂ مومن بغیر خوف کھائے اللہ کی راہ پر گامزن رہتا ہے خواہ کوئی بھی اس کو اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے وہ نہیں ہٹتا۔ بلکہ بڑی سے بڑی طاقت سے اس معاملے میں بھڑ جاتا ہے اور یہی شعر کا اصل مقصد ہے۔

اقبال کا مردِ مومن وہ ہے جسکا تمام تعلق خدا کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ خدا کی ذاتِ عالی سے سب کچھ ہونے کا یقین رکھتا ہے اور یہ کہ مخلوق جسطرح اپنے وجود میں آنے پر خدا کی محتاج تھی اسی طرح نفع اور نقصان دینے میں خدا کی محتاج ہے۔ یہ مردِ مومن خدائی احکام اور خدا کی ذاتِ عالی کو سامنے رکھ کر زندگی گزارتا ہے۔ ظلمتوں کا خاتمہ کرتا ہے۔

ع وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مومن باطل کے خلاف ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس کی فطرت میں جمود، کردار و عمل میں سختی اور برہمی نہیں ہوتی، جس کو شاعرِ مشرق نے کچھ اس طرح بیان کیا۔

ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

دوسری جگہ موصوف نے مومن کے کردار و عمل کو یوں بیان کیا ہے۔

ع نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

بہرحال اقبال کا مردِ مومن کوئی ساکت و جامد یا لکیر کا فقیر نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی پر حاوی اور خدائی احکام کا داعی نظر آتا ہے۔ اقبال نے مردِ مومن کی جو وضاحتیں کی ہیں ان کے لیے صفحات کے صفحات درکار ہیں یہاں حرف اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اسلاف کے مومنانہ اوصاف سے سرفراز فرمائے اور حق کی تقلید کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

اُخوت و مساوات کا علمبردار

قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا امتیاز نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

(بابو چندر پال)

بائیبل سے مؤثر قانون

قرآن کا قانون بلاشبہ بائیبل کے قانون سے زیادہ مؤثر ہے۔

(ڈین اینسٹلی)

تاریخ سندھ

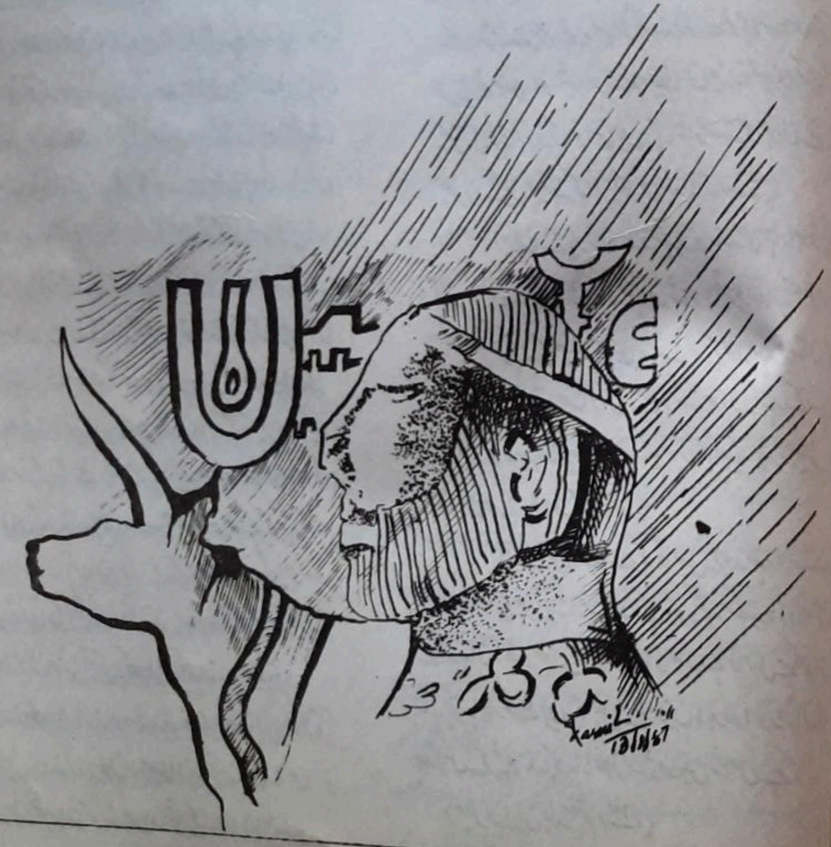

قدیم سندھ کا مختصر تاریخی جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر سرفراز بھٹی
(سندھی مضمون)
شعبۂ ثقافت اسلامی
گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد

ترجمہ
سید شمس الحق بخاری
ایم اے، بی ٹی - ایم ایڈ
استاد، سندھ یونیورسٹی
ماڈل اسکول حیدرآباد

سندھ دنیا کے قدیم مہذب اور متمدن ملکوں میں سے ہے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق اس سرزمین نے بھی بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اس کی عظمتِ رفتہ کے نشانات آج بھی آمری اور موئن جو دڑو میں موجود ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے دنیا یہی جانتی تھی کہ یہاں آریاؤں کی آمد سے قبل وحشت اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ یہاں کے لوگ تہذیب اور تمدن سے ناآشنا تھے۔ تہذیبی ترقی یہاں آریاؤں کی آمد سے شروع ہوئی۔ لیکن ۱۹۲۲ء اور مابعد وادی میں کھدائی ہونے کے بعد صورتحال اس کے برعکس دریافت ہوئی۔ آریاؤں کی نقل و حرکت اور ایران و ہندوستان میں اُن کی آمد کا جو زمانہ مورخین بتلاتے ہیں اُس سے کافی پہلے وادیٔ سندھ کی تہذیب عروج پر تھی اور یہاں کی صنعت و حرفت کا شہرہ دنیا بھر میں تھا۔ یہاں کے تاجر ہمسایہ ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں کی تہذیب کہاں کہاں تک پہنچی۔ عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک سندھ، ہندوستان، کرمان اور سجستان ملکوں سے گھرا ہوا تھا ابنِ خرداد نے قیقان (کیگان قلات)، بنہ (غالباً بنوں)، مکران، مید، قندھار (گندھار) قنبلی، کھمبایا (کھمبات)، سہبان، سندوسان راسک، الرور (الور)، ساوندری، مولتان، سنداں (سجان یا بمبئی)، مندل، بیلمان (بھیلمان یا گجرات) بروص (بروچ) وغیرہ شہروں کو سندھ میں شمار کیا ہے (المالک والممالک ص۵۷) عرب عام طور پر ان حدود کے باشندوں کو سندھی کہتے ہیں۔ سندھ اور سندھی شاہانِ فارس کے زیرِ اقتدار رہے تھے۔ اور یہاں کے راجہ مہاراجہ ان کے باج گزار ہوتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر ایرانی سندھ سے فوجی مدد حاصل کرتے تھے مثلاً انوشیروان نے سیف بن یزن حمیری کسریٰ شاہ یمن کی فوجی مدد کی تو اس میں ایک ہزار سندھی جوان تھے۔ جنھوں نے یمن پر قبضہ کیا (الکامل جلد اوّل ص۵۸)

ایران کے بادشاہ اردشیر نے سندھی مہاراجاؤں کو قفس شاہ، قیقان شاہ، قشمیران شاہ وغیرہ القاب سے نوازا تھا عربوں کی تقسیم کے مطابق سندھ کے بعد ہندوستان کا ملک شروع ہوتا تھا جیسا کہ آج ہے۔ سندھ اور ہند کے درمیان ساحل کے قریب قامہل شہر تھا۔ یہ شہر غالباً بیکانیر، جیسلمیر جوناگڑھ کے اطراف کہیں تھا۔

یاقوت حموی لکھتا ہے کہ قامہل کے بعد ہندوستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ سندھ کے مشہور شہر منصورہ اور قامہل کے درمیان آٹھ مرحلوں یا منزلوں کا فاصلہ ہے قامہل سے کھمبات تک تقریباً چار مرحلے ہیں۔ قامہل سے مکران، بدھا اور ملتان کی حد اس کے نیچے تک کا سارا علاقہ سندھ میں شامل ہے۔
(معجم البلدان جلد ہفتم ص۱۲)

سندھ کے نام کے متعلق قانع اور فرشتہ لکھتے ہیں کہ "ہند" اور "سند" حام بن نوح علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ان کی اور ان کی اولاد کی اس سرزمین پر طویل عرصہ حکومت رہی ہے۔ اس لئے اس ملک کا نام سندھ پڑا۔
تحفۃ الکرام ص۔ تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص۲۱-۲۲

انگریز مورخین رگ وید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سندھ کا نام "سپت سندھو" یعنی سات دریاؤں والا ملک ہونے کی وجہ سے پڑا۔

آریاؤں نے "سندھ" دریا کی وجہ سے یہ نام دیا۔ فارسی میں دریا کے معنی سمندر ہیں۔ ایرانیوں نے "سین" کو "ہ" سے بدلا۔ اس لئے "سپت" تبدیل ہوکر "ہپت" ہوا۔ اسی سپت سندھو کو پارسیوں کی کتاب "زنداوستا" میں ہفت ہندو لکھا گیا ہے۔ اور "ہفت ہندو" کے باشندوں کو "ہندو" نام سے پکارا گیا۔ یونانیوں نے ہنوز کو "انڈوئی" نام دیا۔ یونانی لفظ انڈوئی کی بنا پر انگریزوں نے ہندوؤں کے ملک کو "انڈیا" کہا۔ مسلمان مورخوں نے ہندوؤں کے ملک کو "ہندوستان" کا نام دیا (مہران آف سندھ ص۵) اس لحاظ سے ہندوستان کا اصل نام سندھ ہوگا۔

اس خطے کی صدیوں پہلے کی تاریخ نامعلوم ہے۔ مشہور تاریخ "تحفۃ الکرام" کے مصنف نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ۱۲۱۶ھ سے قبل سندھ کی تاریخ پر کسی نے توجہ نہ دی۔ رچرڈ برٹن لکھتا ہے کہ اس خطے کی سب سے پہلی تاریخ علی ابنِ احمد کوفی کی تصنیف ہے۔ بعد کے تمام مصنفین نے مسلمانوں کی فتح سے ماقبل یا مابعد حالات اسی کی تصنیف سے لفظ بہ لفظ نقل کئے ہیں۔ (سندھ اور سندھ میں بسنے والی قومیں ص۱۲) علی کوفی نے سندھ کی حدود مشرق میں کشمیر تک، مغرب میں مکران تک جنوب میں ساحل سمندر اور دیبل تک اور شمال میں کردوں کے پہاڑ اور کیکانان تک لکھی ہیں۔ ملکی انتظام کے لئے چار حاکم مقرر تھے۔ سیوستان، بدھیہ جنگان، رونجھان، کوہ پایہ اور مکرون تک ۲۔ اسکندہ اور بھاٹیہ۔ ۳۔ ملتان بھکر، برہم پور، کرور، اشہار اور تاکیہ کشمیر کی سرحد تک۔ ۴۔ برہمن آباد نیرون کوٹ کے قلعے سے دیبل، لوہانہ یعنی لاکھوں اور سمّوں کا علاقہ سمندر تک یہ الور (اروڑ) کے راجہ کے ماتحت تھے اور الور۔ ان دنوں "سیحون" دریا پر آباد تھا جسے مہران کہتے ہیں (سندھ اور وادیٔ سندھ کی قومیں ص۱۲) یہ شہر اس زمانے میں مختلف حویلیوں، چراگاہوں، پھولوں، باغوں، حوضوں، نہروں سے آراستہ تھا موجودہ ٹھر پارکر بھی برہمن آباد والے علاقے میں آتا ہے۔ نیپانی لکھتا ہے کہ "سندھ کا سرسبز اور شاداب علاقہ تھا۔ یہاں سندھ دریا کی تین شاخیں واہند، دامن اور ہاکڑو بہتی تھیں۔ واہند کو البیرونی نے "کتاب الہند" میں "ولہند" نام دیا (تاریخ طاہری ص۲۵) میں اسے پنجاب کا دریا ظاہر کیا گیا ہے۔ اس وقت اس دریا کا جغرافیہ ایسا نامعلوم ہے کہ اس کا نام و نشان سندھ کی تاریخوں میں موجود نہیں۔ ریگستان کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس کے آثار مٹ چکے ہیں۔ البتہ راجپوتانہ گزیٹیر اور ٹاڈ کی تاریخ راجستھان میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ٹاڈ لکھتا ہے کہ لودھیانہ جسے اب لودھرا کہا جاتا ہے موجودہ جیسلمیر کے شمال مغرب میں دس میل کے فاصلے پر شکستہ حالت میں ہے۔ یہ شہر دسویں یا بارہویں صدی عیسوی میں بھٹی راجپوت راجاؤں کا راجدھانی تھا۔ اس شہر کے بارہ دروازے تھے اور اس میں بڑے بڑے مندر تھے۔ جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے۔ موئل کی کاک یہیں تھی۔ وہاں سے دریائے سندھ گزرتا تھا۔ کیپٹن ریکس اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تھرپارکر کے علاقہ میں ایک قدیم سلطنت تھی۔ اس کا بڑا شہر پاری نگر تھا جو پہلی صدی عیسوی سے قائم بندرگاہ "کوری نار" کے کنارے پر تھا۔ یہ پاری نگر موجودہ نگرپارکر میں ویراواہ کھنڈر کے مشرق میں تھا۔ اس وقت دریائے سندھ وہاں سے گزر کر کوری نار میں گرتا تھا۔ اب یہ دریا نہیں رہا۔ خشک ہوکر "رن"

میں تبدیل ہوگیا۔ جسے رن کچھ کہا جاتا ہے اور پاری نگر شہر اس وقت کھنڈر بن چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسلمیر کے پاس سے گذرتا ہوا دریا رن کچھ میں آکر ختم ہوتا تھا اس لیئے رن کچھ سمندر کی صورت میں تھا اور کوری نار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

دریائے سندھ کی دوسری شاخ "دامن" موجودہ تھر میں سے گزرتی تھی۔ ریواٹی "مہران آف سندھ" میں لکھتا ہے کہ دریائے سندھ کی ایک شاخ ونجروٹ یا وجناٹ کے قدیم شہر کے پاس سے گذرتی تھی۔ یہ شہر آج کل کھنڈر کی صورت میں سکھر "ضلع کے اباوڑو تعلقہ میں ریتی ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے، ونجروٹ یا وجناٹ والی یہ شاخ واہند دریا سے کسی مقام پر مل کر عمرکوٹ کے مغرب سے ہوتی ہوئی کوری نار میں گرتی تھی۔ تیسری شاخ ہاکڑو دریا اب مشرقی نارو، ڈھورو نارو، جمڑاؤ نہر اور ڈھورو پران کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ موجودہ ڈھورو نارو اور جمڑاؤ نہر کا درمیانی حصہ ہاکڑو دریا کا ایک جزیرہ تھا۔ اسے اب ڈھورو پران کہا جاتا ہے۔ اسے پائٹی نہر کا نام بھی دیا گیا ہے

ریواٹی بتاتا ہے کہ ہاکڑو کے حصے "ڈھورو نارو" میں سے ایک شاخ نکل کر واہند اور دامن کے مشترکہ بہاؤ کے ساتھ عمرکوٹ کے پاس ملتی ہے۔ موجودہ نقشے کے مطابق یہ شاخ "کول شاخ" ہے۔

مہران کے واہند، دامن اور ہاکڑو دریاؤں میں سے نکلنے والی شاخوں کے باعث موجودہ سندھ کا علاقہ چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک جزیرہ مہران، واہند اور دامن کے درمیان تھا۔ دوسرا مہران، واہند، ہاکڑا اور کول شاخ کے درمیان تھا۔ تیسرا صرف ہاکڑا کے درمیان تھا اور چوتھا صرف واہند دریا کا ڈیلٹا تھا۔ پانچواں جزیرہ کول شاخ، واہند ہاکڑا اور سمندر کے درمیان تھا۔ چھٹا سندھو اور ہاکڑا کا دو آبہ تھا۔ ساتواں دریائے سندھ کے بہاؤ میں بھنبھور کے پاس ایک چھوٹا چٹانی جزیرہ تھا۔ ان سب جزیروں کو عرب مورخین نے "بیت" کہتے ہوئے سندھ کی خوشحالی کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالٰی کی مہربانی سے سندھ میں ہر طرح کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ۱۴ سنہ ہجری میں حضرت عمر فاروق رض کو ایک عرب سیاح نے بتایا کہ ہند کے دریا موتی، اس کے پہاڑ یاقوت اور درخت عطر ہیں۔ (عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۴) حضرت عثمان غنی رض کو حکیم نے نظم میں بتایا کہ یہاں کے لوگ بہادر ہیں (چچ نامہ (فارسی) ص ۵) اس سرزمین پر قدیم زمانے سے بڑے بڑے مفکر اور اہل علم پیدا ہوتے رہے ہیں۔ داستان گوئی میں عرب اور عجم کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ میں بھی اہلِ سندھ نے نام پیدا کیا۔ ان کی حکمتِ عملی اور ہوشیاری کے سبب عرب حکمرانوں نے "مبارک المشیر" جیسے لقب دیئے (چچ نامہ (فارسی) ص ۵)

دیانت داری اور سچائی کے باعث خزانوں کی چابیاں ان کے حوالے کی گئیں۔ طب اور جراحت میں مہارت کی وجہ سے دارالشفاء جیسے شعبے ان کے حوالے کئے گئے۔ ان کی جنگ جوئی کے متعلق سید اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں کہ قدیم ایرانی سلاطین سندھی جاٹ (جت) اور میدقوموں کے افراد کو اپنی افواج میں بھرتی کیا تھا اور بحری افواج کے لیئے سیابچہ اور بیاسرہ قبیلوں کے لوگوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ عربوں کے جہازوں کی نگرانی پر سندھی متعین تھے یہ جہازوں پر حملوں کو روکتے ہوئے انہیں ساحلِ مقصود تک پہنچاتے تھے۔ نیز بصرہ، یمن اور بحرین کے جیل خانوں کی حفاظت پر بھی مامور تھے۔ "مجمع البحرین" میں لکھا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بصرہ فتح کیا تو ستر سندھی جاٹوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور خلافت کو تسلیم کیا۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں آپ کا ساتھ دیا۔ بعدازاں یوم مسعود اور یوم زبدہ میں بھی

باقی صفحہ نمبر ۱۱۴ پر

ذوق تربیت

تعلیمی اداروں میں فوجی تربیت کی اہمیت

نیشنل کیڈٹ کور

انوار الحق
انٹر میتھ

آج کل دنیا میں بظاہر امن و سکون نظر آرہا ہے۔ مگر اس خاموشی کی تہہ میں ہزاروں ہنگامے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ ہر قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے، ہر ملک دوسرے ملک کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اور ہر شخص دوسرے شخص کا جان لیوا ہے۔ اس دورِ انتشار میں زندہ رہنے کیلئے طاقت کی ضرورت ہے۔ آج وہی قوم اور وہی ملک پروقار زندگی گزار سکتا ہے۔ جس کے پاس فوجی طاقت اور قومی جذبہ موجود ہو۔ جس قوم کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ تاریخ اور تقدیر دونوں کا یہی فتویٰ ہے۔

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ہم جس پاک مذہب کے پیروکار ہیں وہ ہمیں امن و سکون اور سلامتی کا درس دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق، ملت کے مفادات اور دین کے تقاضوں کا سودا نہیں کرتا۔ جہاں بھی ان میں سے کسی چیز پر آنچ آتی ہو تو اسلام مسلمان کو شمشیر بکف ہو جانے کا حکم دیتا ہے۔ اگر ظلم و ستم کا دور دورہ ہو۔ استبدادی قوتیں کھیل کھیل رہی ہوں، ہستی کی نبضیں تپش آمادہ ہوں، عصمت و آبرو کے آبگینے مجروح ہو رہے ہوں، چادر اور چار دیواری دونوں خطرے میں ہوں تو اسلام مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیتا ہے۔ یعنی مسلمان اللہ کے لیے اللہ کی راہ میں اس وقت تک لڑتا چلا جائے۔ جب تک کہ امن و آشتی بحال نہ ہو جائے گویا اپنی قوت کو مستحکم کرنا عسکری لحاظ سے خود کو اس قابل بنانا کہ کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ ہم نے اسے بیش بہا قربانیوں سے حاصل کیا ہے۔ اس کی تاریخ کے حاشیوں پر ہمارے خون کی رنگینی آج بھی فروزاں ہے۔ پاکستان کے دشمن اسے محض اس لیے ختم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اسلام کا قلعہ ہے۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے قوتِ بازو سے اس قلعہ کو ناقابلِ تسخیر بنا دیں۔

قیامِ پاکستان سے آج تک ہمیں کتنے ہی انقلابات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی خون آشامیاں، ۱۹۶۵ء کی جاں فروشیاں اور ۱۹۷۱ء کے زخم، دلوں اور نگاہوں میں تازہ رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود کو اس قدر مضبوط بنا لیں کہ ہمارا وطن ایک "بنیانٌ مرصوص" "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" بن جائے کہ اس سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جائے۔

حالات کی ان نزاکتوں، وقت کی ان ضرورتوں اور سیاسیاتِ عالم کی ان کروٹوں سے ہماری حکومت بے خبر نہیں ہے۔ حکومت نے ملک میں لازمی فوجی تربیت کا قانون لاگو کر دیا ہے۔ ہر کالج میں طلبہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ فوجی تربیت

حاصل کریں۔ حکومت انہیں ضروری مراعات فراہم کرتی ہے۔ ادارے میں باقاعدہ فوجی عملہ متعین ہے اور ہر کالج کے ٹائم ٹیبل میں اس غرض کیلئے وقت مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ تربیت صرف طلبہ تک محدود نہیں۔ بلکہ اساتذہ کرام بھی اس میں شامل ہیں۔ بالخصوص وہ اساتذہ جن کی عمر ۴۵ سال سے کم ہے۔ یہ ایک ایسا قدم ہے کہ پوری قوم اس کیلئے سراپا سپاس ہے اور پھر اس قوم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جو کتاب بھی رکھتی ہو۔ اور تلوار بھی، علم بھی رکھتی ہو قوت بھی اور فکر کی رفعت کے ساتھ ساتھ عمل کا جوش فراواں بھی اسکے سینے میں سمندر کی لہروں کی طرح موجیں ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

ع محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جب لوگوں کی نظر قوم کے ان نونہالوں کو حرب و ضرب کے خارزاروں میں الجھتے دیکھتی ہے تو بے ساختہ شاعرِ مشرق کا یہ شعر ان کے نہاں خانۂ خیال پر ابھر آتا ہے۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

نیشنل کیڈٹ کور کا سب سے بڑا مقصد نئی پود کو اسلام کے اس عظیم اصول سے روشناس کرانا ہے جسے جہاد کہتے ہیں اس تربیت سے بلا واسطہ اور مقاصد بھی وابستہ ہیں۔ اس تربیت سے نظم و ضبط ابھرتا، اعتماد نکھرتا اور حب الوطنی کا جذبہ سنورتا ہے۔ یہ تربیت دورِ حاضر کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ ضرورت نوجوان نسل کو اپنے تابناک ماضی کی طرف دیکھنے کا ایک فکری موقع مہیا کرتی ہے، جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے متوجہ کیا تھا۔

کبھی اے نوجواں مسلم، تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا۔ تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

یہ تربیت دراصل اسلام کے مجاہدوں کی درخشاں روایات تازہ کرنے کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ وہ مجاہد جن کے سینے شمعِ یقین سے فروزاں تھے۔ جن کا ہر سپاہی سالار اور ہر سالار سپاہی تھا۔ یہ تربیت نوجوان پود کے دل میں جہاد کا وہی جذبہ، ایمان کا وہی سوز اور یقین کی وہی آنچ ابھارتی ہے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی۔ اگر ہم آج وہ جذبہ پیدا کر لیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ عظمت و رفعت ہمارے قدم نہ چومے

ع فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

طلبہ ملک و قوم کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ تاریخ ان ہی کا انتظار کرتی ہے۔ اور قوم انہیں سے اُمیدیں وابستہ کرتے ہوئے ہیں۔ اس عسکری تربیت کے بعد ان پر علم و فکر ہی کی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوں گی۔ بلکہ ملکی سلامتی کیلئے بھی انہیں سر بکف رہنا ہوگا۔ گویا طلبہ کو رزم و بزم یعنی امن اور جنگ دونوں حالتوں میں قوم و ملک کے لیے کام کرنا ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی تاریخ کی تابندہ روایات پیشِ نظر رکھیں۔ اور یاد رکھیں کہ مسلمان مجاہد غیظ و غضب کا پیغام نہیں بلکہ رحم و کرم کا سمندر ہوتا ہے۔ وہ تو غضب کے آتش کدوں کو ٹھنڈا کرتا ہے اور اکڑی ہوئی گردنوں کو خدا کے حضور میں جھکاتا ہے۔ وہ ایک ایسا طوفان ہے۔ جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ ایک ایسی شبنم ہے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بقیہ "قدیم سندھ کا مختصر تاریخی جائزہ"

حصہ لیا۔ بنوامیہ کے خلاف قائم کردہ عبدالرحمن بن اشعث کی جماعت میں سندھی شامل تھے۔ جو حجاج بن یوسف کے زیرِ عتاب آئے۔ سومرہ اور سمہ بادشاہوں کے دورِ حکومت میں نمایاں طور پر سندھ کے لوگوں کی بہادری اور حبّ الوطنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ سومرہ سرداروں نے دہلی سلطنت کو قبول کرنے پر موت کو ترجیح دی۔ ملفوظاتِ مخدوم جہانیاں کے حوالے سے ریاض اللہ لکھتا ہے کہ جام جونی اور جام بنبھنیہ والیانِ سندھ نے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے حکم پر سلطان فیروز شاہ تغلق کی ماتحتی اور فرماں برداری قبول کی تھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کو سندھ سے ڈیڑھ لاکھ ٹکے بطور خراج ملتے تھے۔ جب کہ سلطان دہلی میں سندھی جاموں کو دو لاکھ روپے بطور وظیفہ دیتا تھا۔ سندھ میں سلطان کا نام خطبے میں مصلحتاً شامل کیا گیا تھا۔ سموں کے آخری چشم و چراغ جام فیروزالدین بن جام نظام الدین ننذ کے ساتھ مل کر سندھیوں نے ارغونوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بے مثال بہادری کا ثبوت دیا۔ میر معصوم کے مطابق کچھ اور تھر کے سوڈھوں اور دوسرے راجپوتوں کے پچاس ہزار سواروں اور پیادوں نے جب دشمن کے لشکر کو دیکھا تو گھوڑوں سے اُترے، سر ننگے کئے اور چادریں کمروں سے باندھ کر دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ اسطرح سندھی اسوقت لڑتے ہیں جب وہ مرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

عربوں کی سندھ میں آمد سے پہلے کے سندھی عالموں اور مشاہیر کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس سندھی عالم کا سب سے پہلے نام ملتا ہے وہ مولانا اسلامی ہے۔ یہ دیبل کا باشندہ تھا اور محمد بن قاسم کے عہد میں مسلمان ہوا۔ سندھ کے باہر جن سندھیوں نے علم و ادب کی روشنی بکھیری اُن میں پہلا نام ابو معشر سندھی کا آتا ہے اس کا نام نجیح بن عبدالرحمٰن تھا۔ دوسری صدی ہجری میں اسے جنگی قیدیوں کے ساتھ حجاز لایا گیا تھا کئی خاندانوں کے پاس غلام کی حیثیت سے رہا۔ ہر جگہ علمی سرچشموں سے سیراب ہوتا رہا اور آخر علم حدیث، مغازی، فقہ میں باکمال ہو کر دنیا کے سامنے ظاہر ہوا۔

ابو معشر سندھی کے استادوں میں محمدؐ بن کعب، قرظی ہشام بن عروہ اور نافع وغیرہ شامل ہیں۔ اور شاگردوں میں محمدؐ بن ابی معشر، ابونعیم، وکیع، محمد بن عمر واقدی، امام سفیان ثوری جیسے بلند پایہ لوگوں کا شمار ہوتا ہے اور اس کی روایتوں کو جامع ترمذی میں جگہ دی گئی۔

عربوں کے بعد سندھ میں سومروں کی حکومت شروع ہوئی جو مصر کے فاطمی خلفاء کے زیرِ اثر تھے۔ اس دور میں ملک کی خوشحالی کا حال تو ملتا ہے لیکن علمی حالات اندھیرے میں ہیں۔ اس دور میں مصر کو علمی عروج حاصل تھا اور فاطمی داعیوں کی یہاں آمد و رفت تھی۔ اس لئے یقیناً اُنہوں نے اسی طرز پر یہاں نظامِ تعلیم رائج کرنے کے لئے مدرسے کھولے تھے اور طلباء کی رہائش اور کھانے کا انتظام تھا۔ سوڈوں کے بعد یہاں سموں اور پھر ارغونوں کا دور شروع ہوا میر معصوم بکھری پہلا سندھی مورخ تھا جس نے مشاہیرِ سندھ کے حالات لکھ کر درمیانی عرصے کے حالات پر روشنی ڈالی۔ دوسرا مورخ محمد طاہر نسیانی ہے۔ جس نے ارغونوں اور ترکانوں کی زیادتیوں کا پردہ چاک کیا۔ اس کے بعد میر علی شیر قانع نے کلہوڑا دورِ حکومت کی تاریخ لکھنے میں محنت اور کوشش کی۔ ڈاکٹر بلوچ اور پیر حسام الدین راشدی نے سندھ کے ادبی سرمائے کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ہنوز نامکمل ہے۔ یہ سرمایہ سندھ کے بزرگانِ دین نے ملفوظات کی شکل میں چھوڑا۔ اس سے ہر دور کی سیاست تمدن، معاشرت، مذہبی حالات اور ادبی ماحول کا پتہ ملتا ہے

کھیلوں کے میدان میں

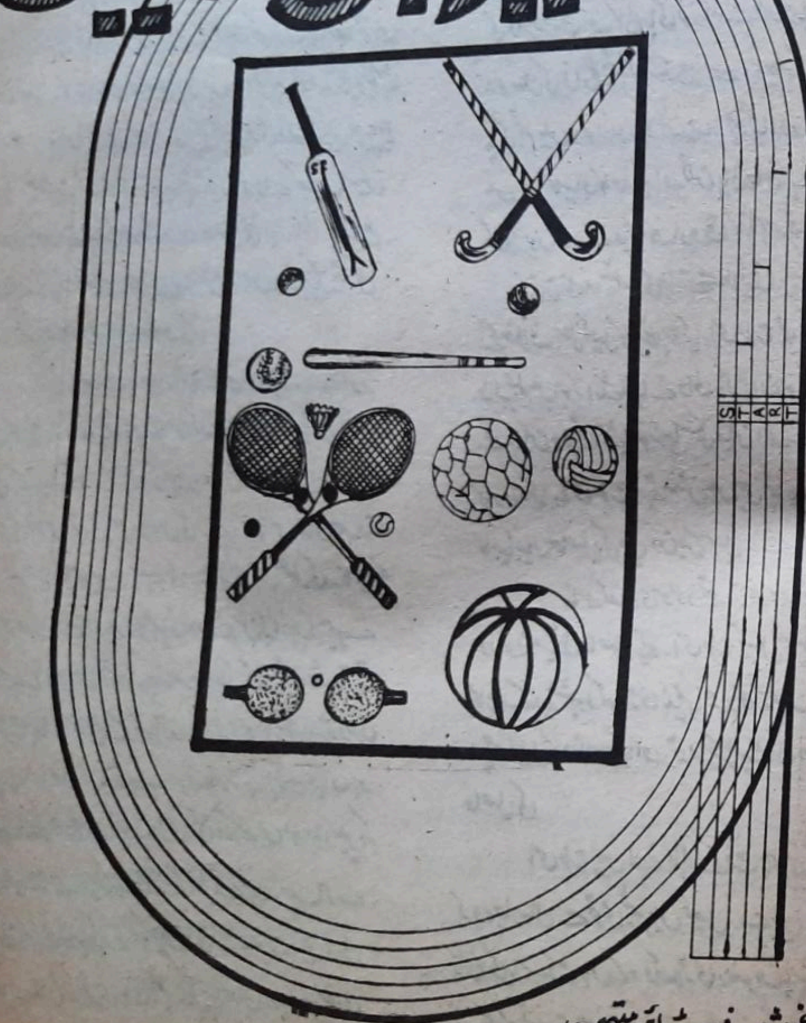

محمد طارق غوث فرسٹ ایئر میتھمیٹکس

کھیلوں کی سرگرمیاں

کالج میں ہر سال کھیلوں کا انعقاد کروایا جاتا ہے۔ ہمارے کالج کی بارہ ٹیمیں بورڈ کے مختلف کھیلوں میں حصہ لیتی ہیں اور نمایاں کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ اس طرح سندھ یونیورسٹی کے کھیلوں میں بھی ہماری ٹیمیں اچھی کارکردگی دکھاتی ہیں ۱۹۸۴ء میں ڈائریکٹریٹ آف کالج کے زیر اہتمام ہونے والے کھیلوں میں ہماری ٹیموں نے نہایت عمدہ کامیابی حاصل کی اور ہاکی۔ باسکٹ بال اور بیڈمنٹن میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ جبکہ ٹیبل ٹینس میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

کالج کا کھیلوں کا معیار شروع سے ہی اچھا رہا ہے اور اس کالج نے اچھے اچھے اور نامور کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔ جہاں کھیل کے معیار کی بات ہے تو ہمارے کالج نے ۱۹۷۷ء میں بورڈ کی جنرل ٹرافی بھی حاصل کی ہے اور اس سال ہماری کرکٹ ٹیم نے انٹر کالجیٹ جیتنے کی ہٹ ٹرک بھی مکمل کی۔ کالج نے اس کے بعد سب سے زیادہ نام ہاکی میں روشن کیا۔ جبکہ ہم نے گذشتہ پانچ سال میں لگاتار چار مرتبہ ہاکی کی چیمپین شپ جیتی اور اسطرح ہمارے کالج کے کھلاڑی بورڈ، یونیورسٹی اور ڈویژن میں کامیابی حاصل کرتے رہے اور سب پر یہ عیاں ہو گیا کہ لطیف آباد کالج میں کھلاڑی اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ ان کو جس فیلڈ میں دیکھو سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ہمارے کالج کی ہاکی ٹیم نے تو ہاکی کے شوقین حضرات کو حیرت میں ڈال دیا جسطرح اس کالج کی کمزور ہاکی ٹیم نے پہلے سال اپنے مدمقابل

کو ہرا دیا۔ وہ فتح ایک اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے بعد تو ہماری ٹیمیں اکثر پہلے کی نسبت اچھی تھیں۔ لیکن جب ۱۹۸۴ء کی ڈائریکٹریٹ آف کالج ہاکی ٹورنامنٹ میں ہماری ٹیم نے پچھلے دو سال کی فاتح ٹیم کو شکست سے دوچار کیا تو ہماری کالج کی ہاکی ٹیم میں ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا اور اب ہمارے ہر کھلاڑی میں کامیابی کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔ کالج کے نامور کھلاڑیوں میں ندیم فاروق کا نام سرفہرست ہے جنہوں کستان انڈر ۱۸ ٹیم کی جانب سے ملائیشیا۔ بیلجیئم اور فرانس کے خلاف اعلیٰ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح محمد اکبر ہمارے کالج کے طالب علم ہیں جو کہ انڈیا جانے والی پاکستان بورڈ کی ٹیم کے ممبر تھے۔ لیکن وہ ٹیم انڈیا تو نہ جا سکی لیکن اس نے پورے پاکستان کا دورہ کیا۔ اسی طرح بیڈمنٹن میں بھی ہمارے کالج نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں ان میں سہیل۔ شاہد اور مظہر جیسے نامور کھلاڑی موجود تھے۔ جنھوں نے اسکالرشپ اور گولڈ میڈل حاصل کیے۔ اسی طرح ٹیبل ٹینس میں ہمارے کالج کے دو مشہور کھلاڑی ندیم احمد اور قسیم خان نے بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا اور ڈائریکٹریٹ کی اسکالرشپ حاصل کی

اسی طرح ہمیں اپنے کالج کے فٹ بالر محمد شمیم پر فخر ہے کہ وہ چار سال سے قومی ٹیم میں کھیل رہے ہیں۔ اسی طرح ہمارے کالج کی باسکٹ بال کے دو کھلاڑی رضوان پاشا اور سہیل محمود بھی سرفہرست ہیں۔ رضوان پاشا نے پاکستان یونیورسٹی

کی نمائندگی کی اور سہیل محمود نے پاکستان بورڈ کی قیادت کی۔

کرکٹ میں بھی ہمارے کھلاڑی سرفہرست ہیں۔ ان میں سے حارث خان نے پاکستان انڈر ۱۹ کی جانب سے آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ کھیلا اور اپنا اور کالج کا نام روشن کیا۔ اسی طرح عبدالوحید نے انٹر یونیورسٹی میں اعلیٰ کارکردگی دکھائی اور پاکستان یونیورسٹی کا کلر حاصل کیا۔

ان کھیلوں کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں بھی ہمارے کھلاڑیوں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمیں ان تمام کھلاڑیوں پر فخر ہے جو ہماری ٹیموں میں کالج کی طرف سے کھیلتے ہیں اور بورڈ اور یونیورسٹی کی ٹیموں میں اپنا سلیکشن کروانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنے کھیلوں کے انچارج ٹیچرز پر بھی بڑا ناز ہے کہ وہ ہمیں آسانیاں مہیا کرتے ہیں۔ جسکی وجہ سے ہمارے کالج کی ٹیمیں اعلیٰ کارکردگی دکھانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ ہمارے کالج کے ڈائریکٹر اسپورٹس جو ہر جگہ اور کالج کے ہر معاملے میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ اگر ہمارے کالج کو مزید فنڈز میسر آئیں تو ہمارا کالج کھیلوں میں اور بھی ترقی کر سکتا ہے۔

ایتھلیٹکس

کھیلوں میں سب سے سخت ترین کھیل ایتھلیٹک ہے اس کھیل میں حصہ لینے والے کھلاڑی کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے کالج میں بہترین ایتھلیٹ زیر تعلیم ہیں جنھوں نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اپنا اور اپنے کالج کا نام روشن کیا ہے۔ ہمارے ان ایتھلیٹوں نے نہ صرف ڈسٹرکٹ، ڈویژن اور صوبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں بلکہ پاکستان میں بھی میڈلز حاصل کیے ہیں۔

اِن ایتھلیٹوں میں سب سے پہلا نام کریم خان کا ہے۔ آپ نے ۱۰۰ میٹر، ۲۰۰ میٹر اور ۴۰۰ میٹر ریس میں اپنی برتری قائم رکھی پاکستان جونیئر انڈر ۱۸ ایتھلیٹکس چیمپین شپ میں ۱۰۰ میٹر ریس میں آپ سونے کا تمغہ حاصل کر چکے ہیں۔ دہلی میں ہونے والے ایشین گیمز ۱۹۸۳ء میں پاکستان ایتھلیٹکس ٹیم کے کیمپ میں شامل تھے۔ اسکے علاوہ سندھ یونیورسٹی اور صوبہ سندھ کی کئی مرتبہ نمائندگی کر چکے ہیں۔

مرزا وسیم بیگ

گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد کے نوجوان کھلاڑی ہیں جنھوں نے کراچی میں منعقد ہونے والی ۵ ویں پاکستان جونیئر انڈر ۲۰ ایتھلیٹکس چیمپین شپ میں حصہ لیا اور جیولن تھرو یونٹ میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور ۳۰ . ۱۶۸ دور جیولن پھینک کر چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ یہ حیدرآباد ڈویژن اور سندھ کے باقاعدہ ممبر ہیں۔

عظیم گل:۔

ٹرپل جمپ میں اپنا منفرد مقام و انداز رکھتے ہیں حیدرآباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی کی مسلسل گذشتہ ۳ سال سے نمائندگی کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں سندھ یونیورسٹی ایتھلیٹکس ٹیم کی کیپٹن شپ کر چکے ہیں۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی کیپٹن شپ میں گورنمنٹ کالج کی ستره ساله تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں سندھ یونیورسٹی کے زیر اہتمام انٹر کالجیٹ ایتھلیٹکس چیمپین شپ میں کالج نے چیمپین شپ ٹرافی حاصل کی۔

عبدالخالق

۲۰۰ میٹر اور ۴۰۰ میٹر ریس میں عبور رکھتے ہیں۔ ۴۰۰ میٹر ریس میں ۵۶۰ سیکنڈ ٹائم کے ساتھ یونیورسٹی کے ریکارڈ ہولڈر ہیں۔ حیدرآباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

سلیم واسطی

۱۵۰۰ میٹر اور ۵۰۰۰ میٹر ریس میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ سندھ ایتھلیٹکس ٹیم کے مستقل ممبر ہیں حیدرآباد ڈسٹرکٹ ڈویژن اور سندھ میں کئی مرتبہ پہلی پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔

میر احسان

جیولین تھرو میں ۱۶۰ فٹ دور جیولین پھینک کر سندھ یونیورسٹی میں ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ کراچی میں ہونے والے انٹر بورڈ ایتھلیٹکس میں جیولین میں پہلی پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔

ہر سال گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد کی جیم خانہ کمیٹی کے زیر نگرانی سالانہ انٹر کلاسز ایتھلیٹک چیمپین شپ کے مقابلوں میں کالج کے کھلاڑی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمد جاوید، طارق خان، شاکر حسین، نعمان، الیاس شیخ، عارف اروقی، عمران اور عظیم کل نوجوان اُبھرتے ہوئے ایتھلیٹس ہیں جو آئندہ کالج کا نام کھیل کے میدان میں ضرور روشن کریں گے۔ کالج کے مندرجہ ذیل کھلاڑی اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر کالج اور اپنے صوبے کا نام روشن کر رہے ہیں۔

ٹیبل ٹینس

ندیم احمد

آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز کے ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ میں اپنے انفرادی مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور مجموعی طور پر کالج کیلئے دوسری پوزیشن حاصل کی اور آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر ڈائریکٹر صاحب نے آپ کو گولڈ میڈل دیا۔ اور اس کے علاوہ آپ کو ڈائریکٹر آف کالجز کی اسکالرشپ بھی ملی۔ آپ ایک سال تک حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی بھی کی۔ اس کے علاوہ آپ کالج کی ٹیم کی قیادت بھی کر چکے ہیں اور انٹر کالجیٹ (بورڈ) میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ حیدرآباد ڈویژن اور حیدرآباد ڈسٹرکٹ کی بھی نمائندگی کر چکے ہیں۔

قسیم قریشی:۔

آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز کے ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ میں کالج کو دوسری پوزیشن پر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ دو سال تک بورڈ کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے حیدرآباد ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کی نمائندگی بھی کی ہے۔

بیڈ منٹن

مظہر اقبال:۔

آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز میں کالج کو پہلی پوزیشن دلوائی اسکے علاوہ آپ نے حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی بھی کی۔ آپ کا شمار حیدرآباد کے صفِ اوّل کے کھلاڑیوں میں ہوتا ہے

آپ نے انٹر یونیورسٹی میں بھی سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کی آپ کی اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر ڈائریکٹریٹ آف کالجز کی اسکالرشپ بھی ملی۔ اس کے علاوہ آپ کو گورنر سندھ نے سندھ اسپورٹس بورڈ میں گولڈ میڈل بھی عنایت کیا۔ آپ نے حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کی بھی نمائندگی کی۔

سُہیل

انہوں نے سندھ کی ٹیم کی نمائندگی کی اس کے علاوہ دو سال تک حیدرآباد بورڈ اور کالج ٹیم کی کپتانی بھی کی۔ اسکے علاوہ حیدرآباد ڈویژن اور ڈسٹرکٹ کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

باسکٹ بال

سُہیل محمود

کالج کے ہونہار کھلاڑی ہیں۔ آپ نے کالج کو پہلی بار ڈائریکٹریٹ آف کالجز باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں فتح سے ہمکنار کروایا۔ اس ٹورنامنٹ میں آپ نے لوگوں سے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے بہت داد حاصل کی۔ آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالج کی اسکالرشپ بھی حاصل کی۔ آپ حیدرآباد بورڈ کے کپتان بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے پاکستان بورڈ کی بھی قیادت کی اور انڈر ۱۹ میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ آپ حیدرآباد ڈویژن اور حیدرآباد ڈسٹرکٹ کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ کالج کیلئے اعلیٰ کارکردگی ادا کرنے پر آپ کو کالج کلر بھی دیا گیا۔

ہاکی

شمس الدین

یہ کالج ہاکی ٹیم کے پہلے کپتان تھے جنھوں نے اس کالج ہاکی ٹیم کو متعارف کروایا اور ان ہی کی کپتانی میں ۱۹۸۰ء میں کالج ٹیم نے ہاکی میں اپنی برتری کا لوہا منوایا شمس الدین نے حیدرآباد زون اور حیدرآباد ڈسٹرکٹ کی بھی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اسکے علاوہ حیدرآباد بورڈ کی بھی نمائندگی کر چکے ہیں۔

رضوان تنویر

آپ کالج کے دوسرے کپتان تھے۔ جنھوں نے ۱۹۸۲ء میں انٹر کالجیٹ ہاکی چیمپین شپ جیت کر کالج کے اس اعزاز کو برقرار رکھا آپ دو سال سے سندھ یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور حیدرآباد زون کی باقاعدہ نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو کالج کا کلر (بلیزر) دیا گیا۔

قمر الاسلام

آپ کالج کے وہ کھلاڑی تھے جن کی قیادت میں ۱۹۸۳ء میں انٹر کالجیٹ ہاکی چیمپین شپ جیت کر ہیٹ ٹرک مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ نے تین سال تک حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی کی اور گذشتہ دو سال سے سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز کی ٹیم کی نمائندگی بھی کی ہے۔ اس کے اعزاز میں آپ اسکالرشپ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے حیدرآباد زون اور ڈسٹرکٹ کی کئی بار نمائندگی کی۔

عبد الحکیم

آپ کی قیادت میں کالج نے ہاکی کا انٹر کالجیٹ مسلسل چوتھی بار جیت کر ۱۹۸۴ء میں نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جس کے صلے میں آپکو کالج کا بلیزر انعام میں دیا گیا۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ نے مسلسل تین سال تک حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ آپ نے حیدرآباد زون کی بھی نمائندگی کی۔

حسن نظر

آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ نے کالج ہاکی ٹیم کو اس ٹورنامنٹ میں کامیابی دلوائی جسکو کالج مسلسل دو سال سے فائنل میں پہنچنے کے باوجود ہار رہا تھا۔ آپکی قیادت میں کالج نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز ہاکی چیمپین شپ میں پہلی بار فتح حاصل کی۔ جس کے اعزاز میں آپکو کالج کا بلیزر انعام میں دیا گیا۔ اس ٹورنامنٹ میں آپ نے ۹ گول اسکور کرنے کا نیا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ جسکے اعزاز میں ڈائریکٹر آف کالجز نے آپ کو ۸۵-۱۹۸۴ء کی اسکالر شپ بھی دی۔ اس کے علاوہ آپ اس ٹیم کے بھی ممبر تھے جس نے تین سال تک بورڈ کا انٹر کالجیٹ جیتا۔ آپنے حیدرآباد زون اور ڈسٹرکٹ کی بھی نمائندگی کی ہے۔

ندیم فاروق

آپ ہمارے کالج کے وہ کھلاڑی ہیں جس پر ہم کو فخر و ناز ہے۔ آپ حیدرآباد کے واحد کھلاڑی ہیں جنھوں نے پاکستان انڈر ۱۸ ٹیم کی جانب سے ملائیشیا، بلجیم اور فرانس کے خلاف میچ کھیلے اور اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ آپ ایک ماہ تک مسلسل پاکستان انڈر ۱۸ کے کیمپ میں اولمپیئن کوچ کے زیر تربیت رہے۔ اس کے علاوہ آپنے سندھ وہائٹ کی نمائندگی کی جس نے انٹر پراونشل ہاکی چیمپین شپ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ تین سال سے مسلسل حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آپ حیدرآباد زون اور حیدرآباد ڈسٹرکٹ کے باقاعدہ رکن ہیں اس سال کی انٹر پراونس چیمپین شپ میں سندھ کی ٹیم کیلئے کیمپ میں آپ کا نام ہے۔ اس کے علاوہ آپنے انٹر کالجیٹ بورڈ اور ڈائریکٹریٹ میں کالج کو کامیابی دلونے میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کو ان کارناموں اور کارکردگی کی بناء پر ۱۹۸۵ء کا بہترین کھلاڑی کا ایوارڈ دیا گیا۔

محمد اکبر

آپ ہمارے کالج کے وہ کھلاڑی ہیں جس نے انڈیا جانے والی پاکستان بورڈ کی ٹیم میں اپنی محنت اور کھیل کی وجہ سے سلیکشن کروایا۔ اور ثابت کر دیا کہ حیدرآباد میں بھی ہاکی کے لیے ٹیلنٹ موجود ہے۔ یہ بورڈ کی ٹیم انڈیا تو نہ جا سکی البتہ اس نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ اور آپ نے پاکستان بورڈ کی جانب سے تمام میچوں میں اچھی کارکردگی دکھائی۔ آپ سندھ گرین کے ممبر تھے جس نے انٹر پراونشل ہاکی چیمپین شپ میں تیسری پوزیشن حاصل کی اور اس سال بھی انٹر پراونس کیلئے سندھ کی ٹیم کے کیمپ میں آپکا نام شامل ہے۔ آپنے دو سال تک پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ حیدرآباد زون کی قیادت بھی کر چکے ہیں اور حیدرآباد ڈسٹرکٹ کے مستقل رکن ہیں۔ آپ نے ڈائریکٹریٹ آف کالجز کی ٹیم کی بھی نمائندگی کی ہے۔

کلر یا BLAZER

سہیل بیڈمنٹن

Ex

انہوں نے سندھ کی ٹیم کی نمائندگی کی اس کے علاوہ

ندیم فاروق (کیپٹن ہاکی ۸۶)

عتیق الدین (کیپٹن ہاکی ۸۵)

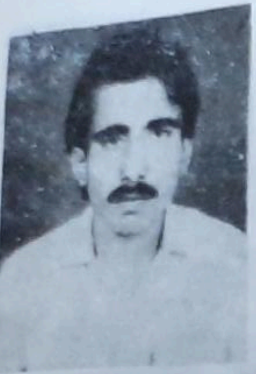

سید حسن نظر (کیپٹن ہاکی ۸۴)

قمر الاسلام (کیپٹن ہاکی ۸۳)

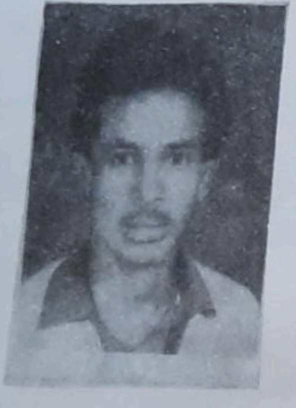

غلام نبی خان (کیپٹن ہاکی ۸۲)

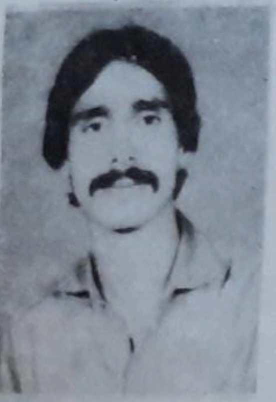

طاہر حسین (کیپٹن ہاکی ۸۱)

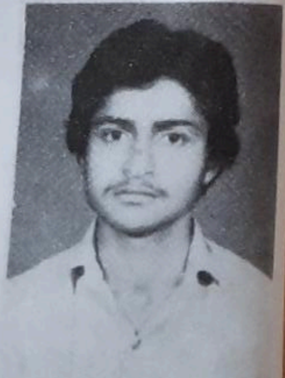

محمد اکبر (ہاکی - پاکستان بورڈ)

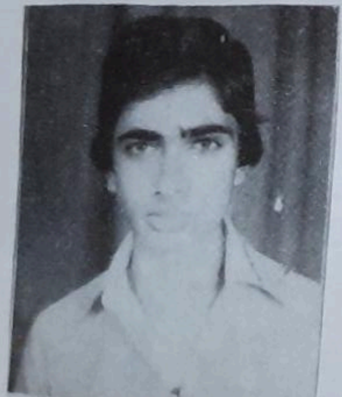

سہیل طارق (سابق کیپٹن بیڈمنٹن)

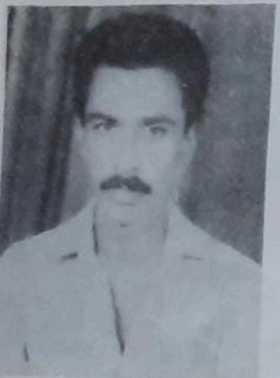

مظہر اقبال (گولڈ میڈلسٹ بیڈمنٹن)

حارث احمد (سابق کیپٹن کرکٹ)

عبدالوحید (کیپٹن کرکٹ ۸۶)

ایس ایم. افضل (کیپٹن لان ٹینس)

محمد عظیم گِل (کیپٹن ایتھلیٹکس ۸۴)

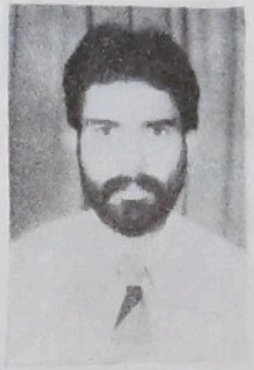

محسن ضمیر (کیپٹن باسکٹ بال ۸۶)

سہیل محمود
(کیپٹن باسکٹ بال ۸۵ ۔ گولڈ میڈلسٹ)

شاکر جعفری (اتھلیٹ (حیدر آباد بورڈ)

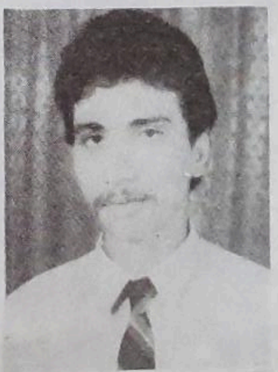

محمد جاوید (ایتھلیٹ (حیدرآباد بورڈ)

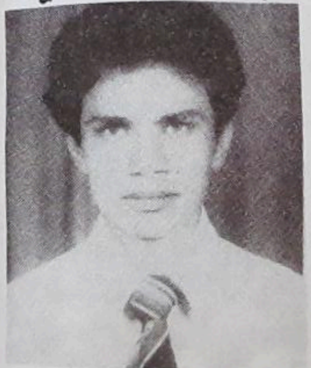

عبدالخالق ایتھلیٹ (سندھ یونیورسٹی)

جشن عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
مہمان خصوصی مظہر علی صدیقی وائس چانسلر جامعہ سندھ
پرنسپل اور دیگر مہمان

یوم حسین کے موقعہ پر
مہمان خصوصی پروفیسر حیدر علی کا اظہار خیال

یوم حسین کے سامعین طلباء

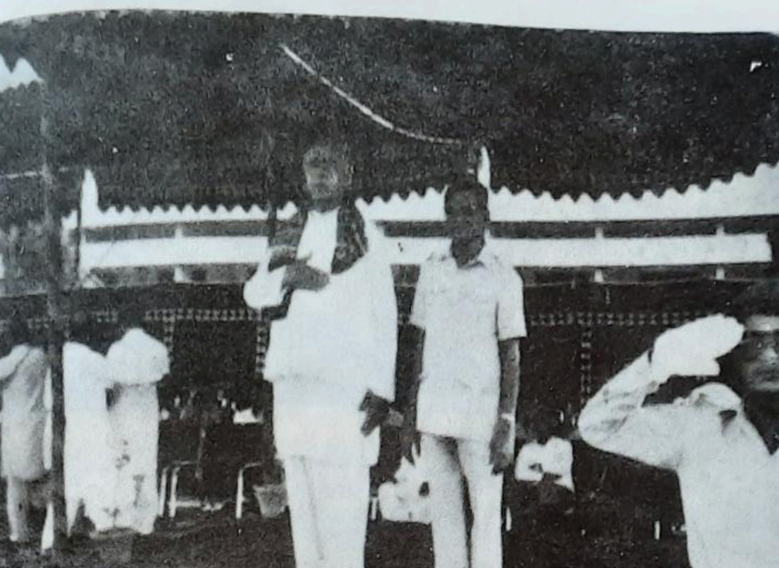

مہمان خصوصی پروفیسر ناصر رضا خاں، پرنسپل پروفیسر ذاکر حسین قریشی کے ہمراہ قومی ترانہ سنتے ہوئے (۸۶ء) تقریب

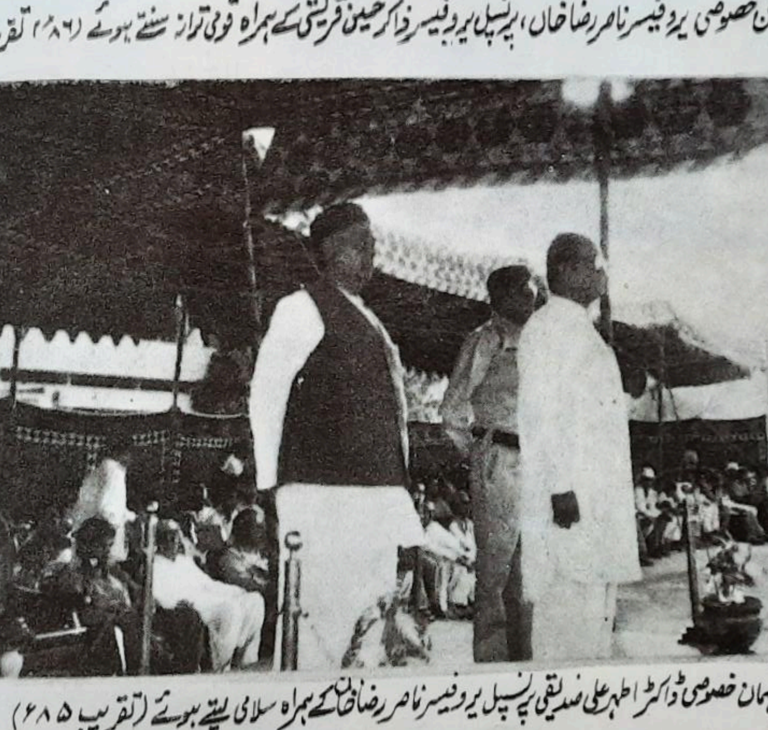

مہمان خصوصی ڈاکٹر اطہر علی صدیقی پرنسپل پروفیسر ناصر رضا خاں کے ہمراہ سلامی لیتے ہوئے (تقریب ۸۵ء)

ناظم تعلیمات
حیدرآباد ریجن
مہمان خصوصی
ڈاکٹر اطہر علی صدیقی
کو باڈی: رشید بیگ
کرتے ہوئے ۔ ۸۵

مہمان خصوصی
پروفیسر رضی الرحمن
ایڈیشنل سیکریٹری تعلیمات
انعام دیتے ہوئے
(تقریب ۸۴ء)

موجودہ پرنسپل
پروفیسر ذاکر حسین قریشی
سابق پرنسپل صاحبان
کے ہمراہ انعامات کے ساتھ
(تقریب ۸۶ء)

اس مُجلّے کی تیاری میں حصہ لینے والے مصور و خطاط

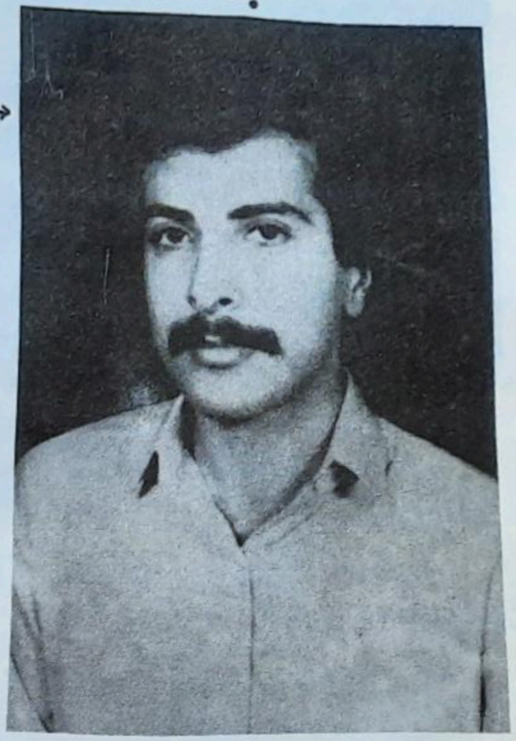

→ پروفیسر نظیر احمد قاسمی شعبۂ نباتیات

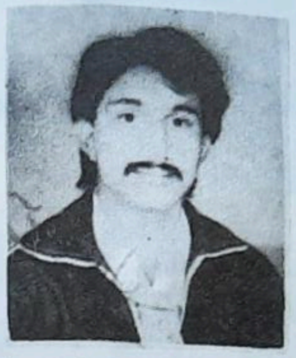

اعجاز احمد زاہد بی ایس سی سال اوّل

منظر احمد فرسٹ ایئر آرٹس ←

محمد طارق غوث فرسٹ ایئر میتھس

...آباد بورڈ اور کالج بیڈمنٹن ٹیم کے کپتان رہے اس کے
...وہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کی بھی نمائندگی کی۔

...محسن ضمیر باسکٹ بال B.SC II

انہوں نے حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی کی اور سندھ یونیورسٹی کی دو سال سے نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور حیدرآباد ڈویژن کی بھی نمائندگی کر چکے ہیں۔

رضوان تنویر ہاکی B.SC I

رضوان تنویر نے یونیورسٹی کی نمائندگی کی ہے۔ آپ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کے باقاعدہ ممبر ہیں اور کالج کی ٹیم ان کی قیادت میں انٹر کالجیٹ چمپین شپ جیت چکی ہے۔

عظیم گل ایتھیلٹکس B.Sc II

حیدرآباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں اس کے علاوہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور حیدرآباد ڈویژن کے باقاعدہ ممبر ہیں۔

عبدالحکیم ہاکی انٹر

یہ مسلسل تین سال سے حیدرآباد بورڈ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اسکے علاوہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کے باقاعدہ ممبر ہیں اور ان کی قیادت میں اس سال کالج ہاکی ٹیم نے مسلسل چوتھی بار انٹر کالجیٹ چمپین شپ جیتی ہے۔

عبدالوحید عرف راشد کوکٹ B.SC I

انہوں نے حیدرآباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ انٹر یونیورسٹی میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ان کو پاکستان یونیورسٹیز کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ ولس کپ میں انہوں نے ساؤتھ زون کی طرف سے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ یہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کے باقاعدہ ممبر ہیں۔

مبارک علی کرکٹ B.A II

یہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ انڈر ۱۹ اور ڈویژن انڈر ۱۹ اور سندھ یونیورسٹی کی ٹیموں کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ انٹر کالجیٹ چمپین شپ میں سچل کالج کے خلاف ۵۰ محدود اوور کے میچ میں ۲۵۰ رنز (ناٹ آؤٹ) بنانا ہے۔

سعید احمد کے کرکٹ B.SC II

یہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ انڈر ۱۹ اور ڈویژن انڈر ۱۹ اور سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں اور حال ہی میں یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہونے والے انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ میں انہوں نے اسلامیہ کالج سکھر کے خلاف نہایت اعلیٰ کارکردگی کرتے ہوئے ۲۰۱ رنز بنائے اور اسی میچ میں ۵ وکٹیں بھی لیں اور تین کیچ بھی پکڑے۔

سردار احمد کرکٹ B.A II

یہ حیدرآباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد ڈسٹرکٹ اور ڈویژن کی بھی نمائندگی کر چکے ہیں۔

حارث احمد خان کرکٹ

حیدرآباد کا دوسرا کرکٹ کا کھلاڑی جس نے حیدرآباد کی طرف سے پاکستان انڈر ۱۹ کی نمائندگی کرتے ہوئے آسٹریلیا انڈر ۱۹ کے خلاف منی ٹیسٹ میچ نیشنل اسٹیڈیم میں کھیلا۔ اسی طرح ساوتھ زون کی طرف سے وائس کپتان کی حیثیت سے سری لنکا انڈر ۲۳ کے خلاف حیدرآباد میں کھیلا۔

ندیم فاروقی ہاکی

آپ ہاکی کے وہ کھلاڑی ہیں جن کا انتخاب ملیشیا انڈر ۲۰ کے خلاف میچ کھیلنے کے لیے لگائے گئے کیمپ میں ہوا۔ آپ نے ملائیشیا فرانس اور بلجیم کے خلاف میچ کھیلے ہیں اور سندھ کی ٹیم جو کر انٹر پراونس چیمپین شپ کھیلے گی اس کے کیمپ میں آپکا نام شامل ہے۔

سُہیل محمود:۔ باسکٹ بال

پہلا حیدرآباد کا باسکٹ بال کا کھلاڑی جسکا نام باسکٹ بال کیمپ پاکستان میں آل پاکستان باسکٹ بال کیمپ پاکستان میں آیا۔

محمد اکبر ہاکی

آپ انڈیا جانے والی پاکستان بورڈ کی ٹیم میں سلیکٹ ہوئے اور اس سال بھی انٹر پراونس کھیلنے سندھ کی ٹیم کے کیمپ میں آپ کا نام شامل ہے۔

قائدِ اعظم کی شخصیت اور لوگوں کی رائے

انوار الحق
انٹر میتھ

(۱)

ایک قوم پرست انسان کی حیثیت سے جناح کی شخصیت قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے ذاتی اغراض کے پیش نظر کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچایا اور اپنی بے لوث خدمات کے عوض ہندوستان کے مسلمانوں کے قائد ہیں۔ ان کا ہر ارادہ ہر مسلمان کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا حکم مسلمانوں کا آخری فیصلہ ہے۔ جس کی انتہائی خلوص کے ساتھ لفظ بلفظ تعمیل کی جاتی ہے۔

(مسز سروجنی نائیڈو)

(۲)

قدرت نے مسٹر جناح کو قیادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ جنگ آزادی میں راستہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو مسٹر جناح جیسے قائد کی ضرورت ہے۔ (پنڈت جواہر لعل نہرو)

(۳)

مسٹر جناح مدتوں سے ہماری زندگی کے ایک عظیم الشان نمائندہ ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ ہر تغیر کے ساتھ ایک مستقل اور بنیادی اصول پر جمے رہے۔ وہ نڈر ہیں۔ بے خوف ہیں صاف گو ہیں۔ شہرت کے طلبگار نہیں۔ وہ ایک ہمہ پہلو شخصیت ہیں اور وہ لوگ بہت کم ہیں جنھوں نے ان کے تنہائی کے قلعے میں رسائی پائی ہو۔ ایک شخصیت جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ تم اس کو چاہے ناپسند کرو چاہے برا کہو۔ مگر اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

(سر فریڈرک جیمز)

سنڌي ڀاڱو

پروفيسر حسن علي ٻگهيو   صدر شعبه سنڌي شعبو

پروفيسر نظير احمد قاسمي شعبہ نباتيات

...ھاي مير شاهه
...ڪچرار اسلامڪ ڪلچر
...گورنمينٽ ڊگري ڪاليج لطيف آباد

رحمته للعالمين

اولاد آدم وٽ خالق ڪائنات جي نعمتن مان سڀ کان زياده حسين ۽ سڀ ...کان زياده پروقار ۽ سڀ کان زياده طاقتور سڀ کان زياده نفي وارو تحفو انهن پيغمبرن ...سيرت ۽ انهن جو اصلاحي ڪارناما آهن جن کي الله‌تعاليٰ وقت بوقت مختلف ملڪن ...پيدا ڪندو رهيو آهي. انسانيت جي عزت ۽ آبرو انهن جي ئي سيرت سان قائم آهي. ...ڪڏهن انسانيت جي تاريخ مان پيغمبرن جي سيرت کي الڳ ڪيو وڃي ته دنيا جي ...تاريخ ڪانڌ پيڻ، هرس، حوس، خود غرضي، جهيڙو، فساد، جهالت ۽ لذالت جو داستان ...جي رهجي وڃي.

اڄ به دنيا ۾ جيڪي اخلاقي قدرون ۽ حقيقتون موجود آهن انسانن وٽ برائي ...کان وڙهڻ، نفس کي قابو ڪرڻ، گناه کان بچڻ جي اندروني طاقت، نيڪي ۽ بدي، ...ظلم ۽ عدل، حق ۽ باطل، ۾ فرق ڪرڻ جو استعداد ۽ انسانن جي بي غرض خدمت ...ڪرڻ جو جيڪو جذبو نظر اچي ٿو سو انهن پيغمبرن جي قربانين ۽ جدوجهد جو ...نتيجو آهي.

انهن پيغمبرن ۾ ڪاميابي سڀ کان زياده جنهن جي حصي ۾ آئي انسانيت ۽ ...تهذيب و تمدن جي سڀ وڏي ڀاڱي جي رهنمائي جنهن جي حوالي ڪئي وئي اهو بلاشبه ...محمد رسول الله جن جي ذات گرامي آهي. جماعتي انسانن مان صرف سندن سيرت ۽ ...زندگي هن وقت تائين محفوظ ۽ دنيا جي رهنمائيءَ لاءِ هر جڳهه موجود آهي اهو انسان ...جو سڀ کان زياده سرمايو آهي.

هن ۾ پيغمبرن جي سيرتن جو تت آسماني هدايت جو جوهر اخلاق ۽ روحاني ...طاقت جو سڀ کان وڏو خزانو لڪل آهي. دنيا جون تاريخون ان ڳالهه تي متفق آهن ...ته آنحضرت جي ولادت وقت دنيا ۾ عموماً عرب ۾ حالترن ايتريون ته خراب ٿي چڪيون

هيون جو ماڻهو تباهيءَ جي غار ۾ ڪرڻ تي اچي پيا هئا انهن ملڪن جا ماڻهون مذهبي سياسي، سماجي طور تي تباهي جي ڪناري تي پهچي چڪا هئا انسانيت جي فلاح ۽ اصلاح جي ڪابه اميد نظر ڪانه ٿي آين اهڙي، وقت ۾ الله پاڪ جي رحمت جوش ۾ آئي ۽ ڪائنات جي پروريءَ لاءِ سرور ڪائنات کي وما ارسلناڪ الا ڪافة للناس جي تاج پهرائي مبعوث فرمايو.

ڪائنات جي سروري ڇا آهي يعني دنيا جي رهنمائي ۽ دنيا جو رهنما اهو ئي ٿي سگهي ٿو جنهن ۾ ملڪي، نسلي، طبقاتي قاعدن ڪان مٿاهون ٿئي، ساري انسانيت جي بهتري ۽ ڀلائي پنهنجي سامهون رکي هوندي بيشڪ هڪ محب وطن قومي اڳواڻ ضرور لائق عزت آهي ته هن پنهنجي ملڪ ۽ قوم جي بي غرض خدمت ڪئي، قرباني ڏني، تڪليفون سٺيون بختي ازادي ۾ سياسي جاڻ جا بهترين نمونا ڏيکاريا غيرن جي ظلمن ۽ پنهنجن جي فسادن جو ڪامياب مقابلو ڪيو هڪ مضبوط حڪومت قائم ڪئي سماجي سڌارا جاري ڪيا انهن سڀني ڳالهين هوندي به اهڙي اڳواڻ متعلق ڪٿي عقيدت هجي، ۽ ان قومي محسن کي پوري قومون پنهنجو رهنما ۽ هادي اڳواڻ تسليم نٿيون ڪن، ڇو ته جنهن جي محبت خير خواهي ۽ ڪارڪردگي هن جي پنهنجي وطن تائين محدود هجي، ته ٻين ملڪن وارا ان کي پنهنجو اڳواڻ ڇو تسليم ڪن؟

سڀني قومن جو اڳواڻ اهوئي ٿي سگهي ٿو جنهجي پيرن ۾ نسل ۽ سرحدن جون زنجيرون نه هجن، جنهجي نظر ۾ سڀئي انسان هڪ هجن، جنهنجي دل ۾ سڀ لاءِ ساڳيو درد ۽ غم هجي جيڪو پنهنجي سوچ، فڪر ۽ عقل جو ثمر ۽ قول ورهائڻ وقت پنهنجن ۽ پراون جو فرق نه رکندو هجي هن جي تعليم زندگيءَ جو ڪو هڪ رخ نه هجي بلڪ پوري تصوير پيش ڪندي هجي هن جا اصول انساني فطرت جي سڀني پهلوئن جو احاطو ڪندا هجن، ۽ ان جي حيثيت عملي يا فلسفي نه هجي بلڪ سراسري عملي هجي انهيءَ کان سواءِ ان هستيءَ جي رونمائي ڪنهن خاص زماني ۾ نه بلڪ هر زماني ۾ ۽ هر حالت ۾ مفيد صحيح ۽ قابل عمل هجي، ان جو پيغام سدا بهار هجي وقت ان جي اصولن جي ترديد ڪرڻ کان عاجز هجي، انجي فيض جو درياهه هميشه جاري رهي، جنهنجي اڳواڻ هڪ دور ۾ مفيد ۽ ٻئي وقت ۾ بيڪار هجي اهو دنيا جو اڳواڻ ٿي نٿو سگهي. دنيا جي سروري ته انهيءَ جو ئي حصو آهي جو جيستائين دنيا ۾ قائم آهي ان جي رهنمائي ۽ رهبري به ڪار آمد رهي اهي سڀئي معيار صرف رحمت ڪائنات صلي الله عليه وسلم جن تي پورا لهن ٿا.

ٻين انبياءِ وانگر حضرت محمد مصطفي جن جا مخاطب هڪ ملڪ يا هڪ قوم

سندن خطاب دنيا جي سڀني انسانن سان هو. قرآن مجيد ۾ دعوت اسلام جي عالمگير هجڻ جو جاءِ بجاءِ اعلان ڪيو ويو آهي جيڪو اسان کي ڪنهن ٻي مذهب جي سندن صحيفن ۾ نه ٿو ملي. قرآن پاڪ جي سورة ابراهيم ۾ ارشاد باري تعاليٰ آهي، وما ارسلناڪ الا رحمته للعالمين هاذا بلاغا للناس.

ترجمو: اي محمد رسول الله صلي الله عليه وسلم اسان توکي ساري دنيا لاءِ رحمت بنائي موڪليو آهي. هيءَ قرآن سڀني انسانن لاءِ پيغام آهي لهاذا جيترو گهرو عالمگير اثر پاڻ ڪريم صلي الله عليه وسلم بني نوع انسان جي تاريخ ۽ تقدير تي وڌو اڄ تائين ڪنهن ٻي انساني حصي ۾ ان جو ڏهون حصو به نه آيو سندن چشم فيض مان ڪا قوم محروم نه رهي نه عربي نه عجمي، نه رنگ نه فرهنگ، نه حبشي نه هندي، بقول ڊاڪٽر G. W. Dreper "سڀني انسانن ۾ سنبل انسانيت تي سڀ کان زياده اثر محمد صاحب جن وڌو آهي." دنيا جي هڪ مورخ ايبوز جو اسلام بابت هي قول آهي "ته هڪ ناقابل فراموش انقلاب جنهن فرض زمين جي سڀني قومن کي هڪ نئين ۽ دائمي طرز جي اثر اندازي ڪئي آهي ٽيويهه سالن جي مختصر عرصي ۾ تقريبا هڪ لک ويهه هزار انسانن جي جميعت تيار ڪرڻ ۽ انهن شخصيتن جو هڪ صديءَ اندر مختلف قومن ۽ ملڪن ۾ پهچڻ ۽ مختلف قومن جو اسلام قبول ڪرڻ. مشرق ۽ مغرب جي قومن جي ترقيءَ لاءِ مسلمانن جي علمي سرمائي کي محفوظ ڪرڻ ۽ مغرب کي ان سان نوازڻ ۽ مسلمانن جي مهيا ڪيل علم، محمد صلي الله عليه وسلم جي نظريه اخوت، ۽ مساوات، غور و فڪر، تدبر ڪائنات تي عمل پيرا ٿيڻ، مذهبي اجاره داري ۽ تعليم جي زنجيرن کي ٽوڙڻ قوانين فطرت تي غور ڪرڻ ۽ عقل کان ڪم وٺڻ ۽ انسانن جو اجوڪي تهذيب و تمدن تي پهچڻ درحقيقت رحمت اللعالمين جي رحمت جو عڪس ۽ پرتو آهي."

دنيا ۾ اڄ جيڪا به نيڪي، شرافت، رحمدلي، وسعت قلبي، خير خواهي، انساني خدمت وغيره وغيره موجود آهي جو سڀ ڪجهه رحمت اللعالمين جي رحمت جو ئي حصو آهي.

مولانا احمد علي صاحب رحم لاهوري

مترجم: سيد غلام رسول شاهه،
لائبريرين گورنمينٽ ڪاليج لطيف آباد

اسلام جو فوجي نظام

استفتاء

جهڙيءَ طرح دنيا جون زنده قومون پنهنجي سنڀال ۽ بچاءَ لاءِ مسلح ۽ باهشيار رهڻ ضروري خيال ڪنديون آهن، ڇا اسلام به پنهنجي تابعدارن ۽ مڃيندڙن کي مسلح ۽ جنگ لاءِ تيار رهڻ جو ڪو حڪم ڏنو آهي يا نه؟ ڪتاب جي حوالي سان ٻڌائيندا، هن جو اوهانکي قيامت جي ڏينهن اجر ملندو!

الجواب

اسلام پنهنجي تابعدارن کي زندگيءَ جي هر شعبي جي بهترين تعليم ڏني ٿو. پوءِ سماجي هجي، اقتصادي هجي يا سياسي. مطلب ته هرهڪ شيءِ جو اسلام بهترين معلم ۽ سينگاريندڙ آهي. ان ڪري اهو ٿي نه ٿو سگهي ته اسلام پنهنجي پوئلڳن کي اهڙي تعليم کان محروم رکي، جنهن کان سواءِ ڪا به قوم دنيا ۾ جيئري رهي نٿي سگهي، ۽ نڪي پنهنجي عزت ۽ معظم شين جي سنڀال رکي سگهي ٿي. هن مختصر تحرير ۾ قرآن حڪيم ۽ نبي ڪريم عليه الصلوات والسلام جي احاديث جي روشنيءَ ۾ فوجي تعليم جو مسئلو آڏو رکجي ٿو. ”اي ڏٺي پاڪ، جيڪي تو سيکاريو آهي ان کانسواءِ اسان کي ڪابه ڄاڻ نه آهي. تحقيق تون ئي ڄاڻندڙ حڪمت وارو آهين.“

فوجي تعليم ۽ سکيا بابت قرآن حڪيم جو ارشاد

هر مسلمان کي پنهنجي حفاظت جو سامان تيار رکڻ ضروري آهي: (واعدوا لهم ما استطعتم — وانتم لا تظلمون) سورت انفال رکوع ٨.

ترجمو: ۽ پنهنجي دشمنن جي نقصان کان بچڻ لاءِ جيتري به قوت گڏ ڪري سگهو تيار رکوا ۽ پاليل گهوڙن سان جو انهن سان الله جي دشمنن ۽ اوهان جي دشمنن

کي پڻ ولي ۽ انهن کان سواءِ ٻين تي جن کي اوهين نه ٿا ڄاڻو الله انهن کي ڄاڻي ٿو ۽ جيڪي به اوهين خرچ ڪندو الله جي واٽ ۾ اهو اوهان کي پورو ملندو ۽ اوهان جو حق نه رهندو.

لفظ قوت جو تفسير: رسولن جي سردار، نبين جي خاتم عليه الصلوت والسلام فرمايو آهي: (قرآن ۾ آيل لفظ) قوت جو مطلب آهي ”رمي“ يعني اها شيءِ جنهن کي ڪان نشانو بنائي دشمن کي زير ڪري سگهجي.

جڏهن ته حضور انور صلي الله عليه وسلم جي زماني ۾ پري کان نشانو بنائڻ لاءِ تيرن جي لڙائي سان ٿيندو هو، ان ڪري ماڻهن ”رمي“ جو تفسير تير اندازي سان ڪيو آهي نه ته اصل مقصد هي آهي ته جنگ جا اهي هٿيار تيار رکيا وڃن، جن سان لڙائي ۾ دشمن کي شڪست ڏني سگهجي.

(٢) هر مسلمان تي فرض آهي ته جڏهن ان کي باطل جي مقابلي ۽ دشمن سان جنگ ڪرڻ لاءِ گهرايو وڃي ته جلدي حاضر ٿئي:
(يا ايها الذين آمنوا ما لكم — قدير) سورت رکوع ٦.

ترجمو: اي ايمان وارو! اوهان کي ڇا آهي؛ جو جڏهن اوهان کي الله جي واٽ ۾ هلڻ لاءِ چيو وڃي ٿو ته اهين زمين ڏانهن ڪري رهيا آهيو! ڇا اوهان آخرت کي ڇڏي دنيا جي حياتي تي خوش ٿيا آهيو، آخرت جي ڀيٽ ۾ دنيا جي حياتي سان نفعو پرائڻ ڪجهه به نه آهي، مگر تمام ٿورو جي اوهين (جهاد لاءِ) نه نڪرندا ته اوهان کي دکدائڪ عذاب ڪندو ۽ اوهان جي عيوض ٻي قوم کي اڳتي ڪندو ۽ اوهين ان کي ڪجهه به نقصان نه پهچائيندو ۽ الله سڀ ڪنهن شيءِ تي سگهارو آهي.

(٣) هر مسلمان الله جي راضپي کي هٿ ڪرڻ ۽ دشمن کي شڪست ڏيڻ لاءِ جان ۽ مال پنهي کي خرچ ڪري. (انفروا خفافا - تعلمون) سورت توبه رکوع ٦.

ترجمو: هلڪا ۽ ڳرا (پنهي حالتن ۾) جهاد لاءِ نڪرو ۽ پنهنجي جانين ۽ مالن سان الله تعاليٰ جي واٽ ۾ نهايت ڪوشش ڪريو. اوهان لاءِ اهو بهتر آهي، جيڪڏهن اوهان کي سمجهه آهي.

(٤) ضرورت وقت جان ۽ مال ڏيڻ کان پاڻ ڪيرائڻ نفاق جي نشاني آهي.
(لا يستاذنك الذين يومنون — يترددون) سورت توبه رکوع ٧.

ترجمو: جن الله ۽ قيامت جي ڏينهن کي مڃيو آهي، سي پنهنجن مالن ۽ جانين سان جهاد ڪرڻ ۾ تو کان موڪل نٿا گهرن ۽ الله پرهيزگارن کي ڄاڻندڙ آهي. انهن

کان سواءِ ٻيو ڪو توڪل نه گهرندو. جيڪي الله ۽ قيامت جي ڏينهن کي نه ٻجهندا آهن ۽ سندن دليون شڪ ۾ پيل آهن. سوءِ اهي پنهنجي شڪ ۾ حيران آهن.
(انما المومنون الذين آمنوا ـــ الصادقون) سورت حجرات رکوع ٢.

ترجمو: حقيقت ۾ مومن رڳو اهي آهن، جن الله ۽ سندس پيغمبر تي ايمان آندو وري (ڪو) شڪ نه ڪيائون ۽ الله جي واٽ ۾ پنهنجن مالن ۽ پنهنجين جانين سان جهاد ڪيائون اهي ئي سچا آهن.

(٥) مسلمان رڳو پنهنجي مالڪ جي راضپي لاءِ جان ۽ مال ڏيندو آهي، اهي ٻئي شيون هاڻي ان جون نه رهيون آهن. ٻيو الله تعاليٰ ان کان خريد ڪري ورتيون آهن، ان ڪري ان کي انهن جي بچائڻ ۽ مالڪ جي واٽ ۾ خرچ نه ڪرڻ جو ڪو به اختيار نه آهي.
(ان الله اشتري من المومنين ـــ الفوز العظيم) سورت توبه رکوع ١٤.

ترجمو: تحقيق الله مومنن کان سندن سر ۽ سندن مال هن ڪري ڳنهي ورتا جو انهن لاءِ بهشت آهي. (اهي) ان (انجام) تي الله جي واٽ ۾ وڙهندا آهن. پوءِ ماريندا (به) آهن ۽ مارجن (به) آهن. جو انجام توريت، انجيل ۽ قرآن ۾ هڪ طرح ٿيل آهي ۽ الله کان وڌيڪ پنهنجي انجام کي پورو ڪندڙ ڪير آهي؟ پوءِ جنهن سودي جي بدران اوهان پالڪي وڪيو آهي، تنهن سان خوش ٿيو ۽ هاڻي اها ئي وڏي ڪاميابي آهي.

(٦) ڪو مسلمان ڪنهن ٻئي مسلمان کي (شرعي سوڪل کان سواءِ) قتل ڪندو ته رب تعاليٰ جي غضب، لعنت ۽ دوزخ جو حقدار ٿيندو.
(ومن يقتل مومنا ـــ عظيما) سورت نساءِ رکوع ١٣.

ترجمو: ۽ جيڪو ڪنهن مسلمان کي ڄاڻي واڻي قتل ڪندو ته ان جي سزا دوزخ آهي، ان ۾ پيو رهندو ۽ خدا جو ان تي ڏمر ٿيو ۽ ان تي ڦٽڪار ڪيائين ۽ ان لاءِ وڏو عذاب تيار ڪيائين.

جهاد بابت احاديث نبوي

(١) دار اسلام ۽ ملت اسلاميه جي حفاظت کان گهبرائڻ نفاق جي نشاني آهي.

ترجمو: حضرت ابو هريره رضي الله تعاليٰ عنه کان روايت آهي، فرمايو رسول خدا صلي الله عليه وسلم ته جيڪو شخص اسلام جي دشمنن سان جنگ ڪرڻ کان سواءِ مري ويو ۽ نڪي ان جهاد جو ارادو ڪيو ته هڪ طرح جي نفاق واري حالت تي مئو. (صحيح مسلم)

حضرت ابو هريره کان ئي روايت آهي ته فرمايو رسول صلي الله عليه وسلم: جنهن ماڻهو خدا سان ملاقات ڪئي (مري ويو) ۽ ان جي عملن ۾ جهاد جو ڪو به اثر نه هو، ته ان جي ايمان ۾ نقصان هوندو. (سنن ترمذي)

ملت اسلاميه جي حفاظت لاءِ تياريءَ جي ترغيب:

حضرت ابو هريره کان روايت آهي ته فرمايو رسول خدا صلي الله عليه وسلم: جنهن ماڻهو خدا جي واٽ (جهاد وغيره) ۾ گهوڙو ٻڌي ڇڏيو ان کي الله تي ايمان آهي ۽ ان جي وعدي جي تصديق ڪري ٿو. ته ڏهن تحقيق ته ان گهوڙي جو کائڻ پيئڻ، لڏ ۽ پيشاب ڪسي ان پاليندڙ شخص جي تارازي (چڱن عملن) ۾ گڏيو ويندو. (صحيح بخاري)

اسلامي خيال کان فوجي لاءِ عزت:

سهل بن سعد رضي الله عنه کان روايت آهي ته اهو رسول الله صلي الله عليه وسلم کان روايت ٿو ڪري ته ڏينهن جي پوئين يا پهرين پاڇي ۾ الله جي واٽ (جهاد وغيره) ۾ خرچ ڪرڻ ساري دنيا ۽ ان جي شين کان بهتر آهي.

وڏن فقيهن وٽ ملڪي ۽ ملي حفاظت جي فوجي خدمت لاءِ تياري هر مسلمان تي فرض آهي.

(ترجمو فقهي عبارت) جهاد فرض ڪفايه آهي. جيڪا شيءِ ڪنهن ٻئي مقصد لاءِ ضروري ٺهرائي وڃي ته اها فرض ڪفايه هوندي آهي، پر ان لاءِ اهو شرط آهي ته ڪنهن جي ادا ڪرڻ سان ادا ٿي وڃي، نه ته فرض عين ٿي پوندي. جهاد فرض ڪفايه آهي.

حلال روزي حاصل ڪرڻ فرض ۾ شامل آهي

حلال رزق ان کي چئبو آهي جيڪو انسان پنهنجي محنت، مشقت ۽ ڪوشش سان هٿ ڪري ۽ ڪنهن کي به تڪليف نه پهچائي. الله تعاليٰ قرآن حڪيم ۾ چئني طرح رزق هٿ ڪرڻ جي هدايت ڪئي آهي.

(اي پيغمبر و پاڪ روزي کائو ۽ نيڪ ڪم ڪريو).

(اي ايمان وارو جيڪي پاڪ شيون آهن (حلال شيون مان کائو).

حلال رزق جا ڪئي قسم آهن، پنهنجي هٿ سان پورهيو ڪرڻ سڀ کان بهتر طريقو آهي. حضرت دائود عليه السلام پنهنجي هٿ سان پورهيو ڪري ڪمائيندو هو.

حلال روزي حاصل ڪرڻ فرض ۾ شامل آهي

حضرت عبد الله ابن مسعود رضي الله عنه جن کان روايت آهي ته پاڻ ڪريم صلي الله عليه وسلم جن فرمايو ته روزيءَ جو فڪر ڪريو ۽ ڪوشش ڪريو جو اهو به فرض ۾ شامل آهي.

ڪن عالمن ان حديث جو مفهوم سمجهايو آهي ته جيترو روزو ۽ نماز فرض ۾ شامل ٿين ٿا ۽ انهن جو پهريون درجو آهي، ته بعد ۾ حلال رزق حاصل ڪرڻ جو درجو آهي.

جيڪڏهن بندو حلال رزق حاصل ڪرڻ ۾ سستي ڪندو ته ڪيس وڏي تڪليف ڏسڻي پوندي، ان ڪري حلال رزق حاصل ڪرڻ به عبادت ۾ شامل آهي.

حلال روزي ڪمائيندڙ مزدور، واپاري، ۽ ڪڙمي الله وٽ وڏو درجو ٿا حاصل ڪن جيتري قدر واپار جو تعلق آهي ته ان ۾ وڏي ذميواري آهي. اڄڪلهه واپار نفعي خاطر جهجهو پيسو ميڙڻ جي ارادي سان وڏا ظلم ڪرڻ کان به ڪين ٿا ڪيپائين، جيڪڏهن هو سچائي ۽ ايمانداريءَ سان واجبي نفعو کائين ته جيڪر الله تعاليٰ سندن رزق ڪشادو ڪري، ڇو ته رزق جي ذميواري الله جي ئي آهي.

حضرت ابو سعيد خدري رضي جن فرمائين ٿا ته پاڻ رسول صلي الله عليه وسلم

جن کان ٻڌو هٿائون ته ايماندار واپاري نبين، شهيدن ۽ صديقن جي قطار ۾ هوندو. اها حديث ڪيترن ئي حديث جي ڪتابن ۾ آيل آهي. قرآن شريف ۾ فرمايل آهي:

جيڪي الله ۽ رسول جي اطاعت ڪن ٿا، انهن تي الله تعاليٰ پنهنجون نعمتون نازل ڪري ٿو اهي نبي، صديق، شهيد ۽ صالح ٿيندا آهن اهي ئي سٺا دوست آهن.

صحيح معنيٰ ۾ واپار هڪ برڪ آهي بندي ۽ خدا جي وچ ۾ جو ته واپار ۾ فائدو به ٿيندو ته نقصان به ٿيندو. اڄ ڪلهه ڪو به نقصان سهڻ لاءِ تيار ڪونهي ۽ نڪي صبر اختيار ڪرڻ چاهي ٿو پاڪر رات وچ ۾ مالدار ٿيڻ چاهي ٿو تنهن ڪري غلط وات وٺي ٿو.

هيل تائين مزدورن جو واپار ٻي ڳالهه هئي، هاڻ بوک جو ذڪر ايندو. بوک هڪ عظيم ڏنڊو آهي جنهن ۾ مستقل محنت ڪرڻي پوي ٿي بوک ڪندڙ کي الله تعاليٰ دنيوي فائدن کان سواءِ ديني فائدا ۽ آخرت جي ڀلائي به نصيب ڪري ٿو هن حديث مان توهان اندازو لڳايو.

(حضرت ابو هريره رضي الله کان روايت آهي رسول الله صلي الله عليه وسلم جن فرمايو ته جيڪڏهن ڪو مومن وڻ پوکي، يا پوک ڪري پوءِ ان مان ماڻهو پکي ۽ جانور کائين ته ان لاءِ صدقي جو ثواب آهي).

توهان ڏسندو ته پوک ۾ شين تيار ٿي وينديون آهن ته پورو ڏيڍ ۾ اتان ايندي ويندي کائيندا ۽ پکي پکڻ به کائيندا ان ۾ الله تعاليٰ اجر عطا فرمائي ٿو چاهي پوکيندڙ کي معلوم هجي نه هجي پر سندس ثواب جي دفتر ۾ هن جو ثواب لکيو ويندو صدقو ڪرڻ هڪ وڏو نيڪ ڪم آهي جنهن مان الله ۽ بندي جو تعلق وڌي ٿو.

شاه ڀٽائي فرمائي ٿو ته:

روزو ۽ نمازون ٻڻ چڱو ڪم
اهو ڪو ٻيو فهم جنهن سان پسجي پرينءَ کي.

حلال روزيءَ جا فائدا:

حلال روزي کائڻ سان انسان لاءِ راه کلي وڃي ٿي، هو جسماني صحت ۽ ڀلائي ماڻي ٿو، پنهنجي قوم ۽ خاندان ۽ عزت وارو ٿئي ٿو، الله تعاليٰ هن کي اولاد صالح عطا فرمائي ٿو دين هن لاءِ آسان ٿي وڃي ٿو جڏهن دين آسان ٿئي ٿو ته دنيا از خود سڌري وڃي ٿي، هن جون رنڊڪون دور ٿيو وڃن ٿيون. ۽ تڪليفون به آسان ٿي وڃن ٿيون يا انهن تي صبر جي توفيق عطا ٿي وڃي ٿي. انساني سمورا عضوا

اطاعت الاهيءَ ۾ آسانيءَ سان استعمال ڪرڻ ٿا، نفس اطاعت گذار، قانع ۽ شاڪر ٿي وڃي ٿو. الله جي واٽ ۾ خير خيرات ڪرڻ آسان ٿي وڃي ٿو. مطلب ته حلال روزيءَ جا بيشمار فائدا آهن بشرطيڪ روزيءَ کي خالص رکيو وڃي. بعض اوقات ماڻهو جائز طور تي بدن کي جاڪوڙ ۽ تن کي تسيون ڏئي روزي گڏ ڪري رکندا آهن پر ان ان زڪوات نه ڪڍندا آهن تنهن ڪري مال ناپاڪ ٿي ويندو آهي، مال جي محبت دل ۾ وڌي ويندي آهي. مال جي محبت هر برائيءَ جو بنياد آهي. هن دور ۾ جيڪي برايون آهن سي حلال روزي نه هئڻ ڪري يا ملاوٽ ڪرڻ ڪري ٿيون آهن.

حلال جون برڪتون اڻ ڪٿ آهن

حلال جو باب پورو ٿيو ته حرام تي ڪجهه روشني ضروري آهي.

حــرام

حرام نالو آهي ان کاڌي پيتي جو يا روزي جو جيڪا انسان حقيقي طور تي پنهنجي بازن جي، استعمال ڪرڻ کان سواءِ هٿ ڪري، يا غير پسنديده طريقي سان حاصل ڪري جنهن سان ٻين کي تڪليف پهتي هجي. مثلا: چوري، ڦڳي، زور زبردستي سان ڦر ڪرڻ امانت ۾ خيانت ڪرڻ وياج کائڻ ۽ رشوت وغيره وٺڻ.

قرآن حڪيم ۾ اهڙن ڪرتوتن کي ننديو ويو آهي. ڪنهن ڪنهن وقت ماڻهو پنهنجي حلال جي ڪمائي ۾ حرام گڏي ڇڏيندا آهن.

رسول الله صلي الله عليه وسلم جي هن سلسلي ۾ هدايتن جو صحابن سڳورن جي زندگيءَ تي ڪهڙو اثر پيو، ان جو اندازو هن ٻن واقعن مان ڪري سگهجي ٿو.

صحيح بخاري ۾ حضرت صديق اڪبر رضي الله عنه کان هيءُ واقعو روايت ۾ اچي ٿو ته هڪ غلام ڪا کاڌي جي شيءِ سندن خدمت ۾ پيش ڪئي، پاڻ ان مان ڪجهه کائي ڇڏيائون، غلام عرض ڪيو ته اها شيءِ مون کي هن ذريعي حاصل ٿي ته اسلام جي دور کان اڳ جاهليت جي دور ۾ مون هڪ ماڻهوءَ کي، پنهنجو پاڻ جادوگر سڏائيندي دوکو ڏنو هو، جيئن جادوگر ٻڌائيندا آهن. اڄ هو ماڻهو مونکي مليو ۽ ان حساب ۾ مونکي هيءَ شيءِ ڏنائين. حضرت ابابڪر صديق رضه کي جڏهن اها خبر پئي، ته پاڻ نڙيءَ ۾ آڱر هڻي قعي ڪيائون، جهڪي به پيٽ ۾ هو سو ڪڍي ڇڏيائون.

اهڙي طرح امام بيهقي ۾ حضرت عمر رضه جو هڪ واقعو آهي ته هڪ دفعي ڪنهن

شخص حضرت عمر رضه جي خدمت ۾ کير پيش ڪيو پاڻ اهو قبول ڪري پي ڇڏيائون پاڻ ماڻهوءَ کان پڇيائون، ته توهان اهو کير ڪٿان آندو؟ ان شخص ٻڌايو ته، فلاڻي گهٽ کان لنگهيس ته زڪوات جا جانور، ڏاچيون ۽ ٻڪريون اتي چري رهيون هيون ماڻهون انهن جو کير پئي ڏڌو، انهن مون کي به هي کير ڏنو. حضرت عمر رضه کي جڏهن اها خبر پئي ته حضرت ابوبڪر رضه وانگر نڙيءَ ۾ آڱر هڻي الٽي ڪيائون.

حضرت عبدالله ابن عمر رضه کان روايت آهي ته پاڻ فرمايائون ته جنهن شخص ڏهن درهمن ۾ ڪو ڪپڙو خريد ڪيو، انهن مان هڪ درهم حرام جو هو، ته جيستائين اهو ڪپڙو ان جي بدن تي هوندو، ان جي ڪابه نماز الله وٽ قبول نه ٿيندي.

بيان ڪن ٿا حضرت عبدالله بن عمر پنهنجون ٻه آڱريون پنهنجن ٻنهي ڪنن ۾ وڌيون ۽ چيو ته ٻوڙا ٿي وڃن منهنجا هي ٻئي ڪن جيڪڏهن مون حضور اڪرم صلعم جن کان هي ڳالهيون نه ٻڌيون هجن. (بخاري ۽ مسلم)

حضرت جابر رضه کان روايت آهي، ته پاڻ رسول صلعم جن فرمايو ته اهو گوشت جنت ۾ نه ويندو، جنهن جو وڌڻ ۽ ويجهڻ حرام جي مال مان ٿيو هجي، ۽ گوشت (جسم) جيڪو حرام جي مال تي پليو هجي يا وڌيو هجي اهو گوشت دوزخ ۾ وڃڻ جي لائق آهي. (بخاري - مسلم)

حرام کي سخت نموني ۾ ننديو ويو آهي. حضور صلعم جن جي نهايت هڪ جامع حديث آهي، جنهن ۾ پاڻ صاف طور تي سمجهايو اٿس، ته حرام مال کائڻ يا واپرائڻ سان ڪهڙا نتيجا نڪرن ٿا. ملاحظه فرمايو:

حضرت ابو هريره رضه کان روايت آهي ته فرمايو رسول صلعم ته ستن تباهه ڪندڙ گناهن کان پاڻ بچايو. صحابن عرض ڪيو ته يا رسول الله ڪهڙا ست گناهه؟ پاڻ فرمايائون ته الله سان (ان جي عبادت، صفتن يا ڪنهن فعل ۾) شريڪ ڪرڻ، جادو ڪرڻ، ناحق ڪنهن ماڻهوءَ کي خوار ڪرڻ، وياج کائڻ، يتيمن جو مال کائڻ جهاد ۾ لشڪر جو ساٿ ڇڏڻ، الله جي پاڪدامن سادين سودين مومنياڻين تي زنا جي تهمت هڻڻ. واضح ٿيو ته هر مسلمان کي رزق حلال جي جيڪا تلقين ڪئي وئي آهي، دين اسلام جي ٻولڻ کي ان هدايت تي عمل ڪرڻ گهرجي، حلال رزق حاصل ڪرڻ گهرجي ۽ حرام کان پاسو ڪجي.

ڊاڪٽر محمد شيخ
ليڪچرار حيوانات
گورنمينٽ ڊگري ڪاليج لطيف آباد

مڇين جي باري ۾ معلومات

١- پاڻي ۾ رهڻ جي باوجود مڇين جون اکيون کليل هونديون آهن ۽ هو اکين کي بند ڪري نه سگهنديون آهن.

٢- وهيل (Whale) مڇي پنهنجي ٻارن کي کير پياريندي آهي ۽ ان لاءِ کيس باقاعدي ٿڻ ٿيندا آهن.

٣- نيري وهيل(Blue Whale) مڇيءَ جو ٻچو ڄمڻ وقت 20 ننٽ ڊگهو هوندو آهي.

٤- وهيل (Whale) مڇيءَ جي ڊيگهه 60 نوٽن ٽائين به هوندي آهي.

٥- وهيل (Whale) مڇيءَ کي تقريبا اڍائي هزار (2,500) ڏند ٿيندا آهن.

٦- ڊالفن (Dolphin) مڇي پاڻيءَ ۾ اڇي رنگ جي هوندي آهي پر پاڻيءَ کان ٻاهر نڪرڻ سان مختلف رنگ تبديل ڪندي آهي.

٧- ڊالفن Dolphin مڇي پاڻيءَ اندر 30 کان 35 ميل في ڪلاڪ جي رفتار سان ٻچي سگهي ٿي.

٨- ڊالفن Dolphin مڇيءَ کي سمنڊ جو رانديگر (Player of the sea) سڏيو ويندو آهي ڇاڪاڻ ته هوءَ پاڻي ۾ مختلف ڪرتب ڪندي آهي.

٩- ڳاڙهي ميڊوسا (Red Medusa) هڪ تمام خوبصورت هجڻ سان گڏ اهڙي ته زهريلي آهي جو هڪ ماڻهو کي صرف 60 سيڪنڊن ۾ ماري سگهي ٿي.

١٠- Spring Dog-fish نالي مڇي بدن مان سائي رنگ جي روشني ڪيندي آهي.

١١- سورو Souro مڇي مڇني مڇين ۾ ترڻ ۾ تيز آهي ۽ هڪ ڪلاڪ ۾ تقريبا 60 ميل تري سگهندي آهي.

١٢- پلائيز Plies مڇيءَ کي ٻئي اکيون مٿي ۾ مڇي پاسي ٿينديون آهن.

خالد حيات لطلماڻي
اسسٽنٽ پروفيسر ڪيميا
گورنمينٽ ڪاليج لطيف آباد

ائٽم جي ڪهاڻي

ٻي مها ٻاري لڙائي دوران سن ١٩٤٥ع ۾ جاپان جي شهرن هيرو شاما ۽ ناگا ساڪي تي آمريڪا طرفان اڇلايل ائٽم بم جي تباه ڪارين جي هر باشعور انسان پڙهيل توڙي اڻ پڙهيل کي خبر آهي ته هن خونخوار مردم ڪش سانحي ڪانپوءِ عام ماڻهو جڏهن به لفظ "ائٽم" ٻڌي يا پڙهي ته هن جي ذهن ۾ هڪدم ائٽم بم ۽ ان جون تباه ڪاريون اچن ٿيون، پر حقيقت ان کان مختلف آهي.

در حقيقت هي لفظ يونان جي فلسفي ڊيمو ڪرائٽس جي ايجاد آهي جنهن سن 500 B.C. يعني عيسوي سن کان پنج سو سال اڳ اهو خيال پيش ڪيو ته جيڪڏهن ڪنهن به مادي جي ٽڪر کي ٻچي پور ڪجي، وري هر ذري جا وڌيڪ پور ڪجن ۽ اهو سلسلو جاري رکجي ته بالآخر اهڙا ذرڙا حاصل ٿيندا جن کي وڌيڪ ٻچي نه سگهبو. اهڙن خيالي ذرڙن کي هن A-tome چيو جنهن جي معني آهي "اڻٽٽندڙ" يا "نه ورڇي سگهجندڙ." بعد ۾ اهو نالو ڦري Atom ائٽم ٿي پيو.

هي ڪل ڪائنات مادي ۽ توانائي جي ٺهيل آهي. مادو Matter هر اهڙي شئي کي چئجي ٿو جيڪا جاءِ والاري ۽ وزن رکي ٿي، مادو عنصرن Elements جو ٺهيل آهي جن جو تعداد هن وقت تائين 105 آهي جن مان گهڻا ڌاتو ۽ ڪجهه غير ڌاتو آهن جهڙوڪ: سون، چاندي ٽامون لوهه وغيره ڌاتو آهن ۽ هائيڊروجن آڪسيجن نائيٽروجن ۽ ڪاربان وغيره غير ڌاتو آهن. عنصر وري ائٽمن جا ٺهيل آهن. ڪنهن به عنصر جو اهو ننڍي ۾ ننڍو ذرو جيڪو ڪيميائي عمل ۾ حصو وٺي سگهي ٿو پر آزاد حالت ۾ رهي نه ٿو سگهي ان کي ائٽم چئبو آهي." ڪجهه عنصر اهڙا آهن جي عام طرح ڪيميائي عمل ۾ حصو نه ٿا وٺن انهن کي نوبل گئسون چوندا آهن. نوبل گئسن جا ائٽم آزاد حالت ۾ رهي نه ٿا سگهن اها هڪ غير معمولي ۽ الڳ ڳالهه آهي.

تجربن وسيلي اهو ثابت ڪيو ويو آهي ته ائٽم اڻ ٽٽ ذرو نه آهي بلڪ

ان کي وڌيڪ ذرڙن ۾ ٽوڙي سگهجي ٿو پر پوءِ نه ته انهن ذرڙن کي جوڙي واپس
ائٽم ٺاهي سگهجي ٿو ۽ نه ئي اهي ذرڙا ڪيميائي عمل ۾ حصو وٺندا ۽ عنصر جون
خاصيتون ڏيکاريندا. هن وقت تائين ائٽم جا تقريبا ٽي سو جزا ثابت ڪيا ويا آهن جن مان
ٽي بنيادي نوعيت جا آهن اهي هي آهن:

١- پروٽان ٢- نيوٽران ٣- اليڪٽران

١ — پروٽان:

هائيڊروجن جي ائٽم مان هڪ اليڪٽران ڪڍي ڇڏجي ته باقي جيڪو ذرو
بچندو تنهن کي پروٽان چئبو آهي. هي اليڪٽران کان 1836 ڀيرا وڌيڪ ڳرو هوندو
آهي هنجو ائٽمي وزن 1.00727663 ائٽمي ماس يونٽ يا 1.67252×10^{-24} گرام
آهي هن تي ايڪو واڌو (+) بار آهي جيڪو 1.602×10^{-19} ڪولمب جي برابر
آهي هي هميشه ائٽم جي مرڪز ۾ ٿيندو آهي.

٢- نيوٽران:

هي ذرو پروٽان سان گڏ مرڪز ۾ ٿيندو آهي. هن جو وزن تقريبا پروٽان جي
برابر ٿيندو آهي، هن تي ڪوبه بجلي بار نه ٿيندو آهي.

٣ — اليڪٽران:

هي ذرو پروٽان ۽ نيوٽران کان گهڻو ننڍو ۽ هلڪو آهي. هن جو وزن پروٽان
جي وزن جي $\frac{1}{1836}$ حصي برابر آهي. هن تي بجلي بار پروٽان جيترو پر انجي ابتڙ
يعني ڪاٽو (—) ٿيندو آهي، جيڪو 1.602×10^{-19} ڪولمب جي برابر آهي. هي
ذرڙا مرڪز جي ٻاهران گهمندا آهن.

ائٽم تمام ننڍو ٿيندو آهي جنهنڪي اڄ ڏينهن تائين ڪير به ڏسي نه سگهيو آهي
جنهنڪري ان جي اصل تصوير ڪير به پيش ڪري نه سگهيو آهي البت ائٽم جي
خيالي تصوير خاڪا ۽ ماڊل مختلف سائنسدانن پيش ڪيا آهن جيڪي سندن نظرين تي
ٻڌل آهن جهڙوڪ:

١- جي جي ٿامسن جو ٻال وارو نظريو
٢- ردر فورڊ جو نظام شمسي وارو نظريو يا پلئنٽري نظريو

٣- بوهر جو نظريو
٤- سومر فيلڊ جو نظريو
٥- ڪائنٽم مڪئنڪس جو لهري نظريو جنهن لاءِ ڊي بروگلي ۽ شروڊنگر جا
نالا قابل ذڪر آهن.

هنن نظرين کي تفصيل سان سمجهڻ لاءِ تمام گهڻي مئٿميٽڪس جو استعمال
ڪرڻو پوندو ۽ تمام گهڻو مواد لکڻو پوندو جيڪو هن ڪتاب جي حيثيت کان ٻاهر
آهي علاوه ازين هن مضمون جو مقصد عام ماڻهو ۽ سائنس توڙي آرٽس جي شاگردن
کي ائٽم سان متعارف ڪرائڻ آهي تنهن ڪري هتي صرف سرسري طرح ائٽم جي
بناوٽ جي باري ۾ موجوده صورتحال پيش ڪجي ٿي.

ائٽم جا ٻه ڀاڱا يا حصا آهن اهي آهن

١- مرڪز ٢- مرڪز جي چوڌاري چڪر ڏيندڙ اليڪٽران

١- مرڪز NUCLEUS:-

هي ائٽم جو تمام ننڍو حصو آهي. هڪ اندازي موجب جيڪڏهن ائٽم جو
مرڪز ڪرڪيٽ جي بال جيڏو هجي ته ڪل ائٽم ايڏو وڏو هوندو جنهن جو قطر
(Diameter) ٽي ڪلو ميٽر هوندو ٻي طرف ائٽم جي حقيقي مقدار بابت هن ڳالهه مان
اندازو ڪري سگهجي ٿو ته هڪ مڪعب سينٽيميٽر لوهه جي ٽڪر ۾
850000000000000000000000.0 يا 8.5×10^{-21} ائٽم موجود هوندا آهن. اهو
تعداد معلوم ڪرڻ آسان آهي جنهن لاءِ فارمولا آهي:

$$\text{عنصر جي هڪ مڪعب سينٽيميٽر ۾ ائٽمن جو تعداد} = \frac{\text{عنصر جي گهاٽائي}}{\text{عنصر جو ائٽمي وزن}} \times 6.02 \times 10^{-23}$$

هن مان اندازو لڳائي سگهجي ٿو ته ائٽم ڪيڏو نه ننڍڙو آهي.

هاڻي اچون ٿا پنهنجي اصل مقصد تي ته مرڪز ۾ ڇا آهي؟ مرڪز ۾ پروٽان
۽ نيوٽران ٿيندا آهن. عام هائيڊروجن جي ائٽم جي مرڪز ۾ صرف هڪ پروٽان ٿيندو
آهي ۽ نيوٽران نه ٿيندا آهن. ان کان علاوه باقي عنصرن جي ائٽم جي مرڪز ۾ يا
ته پروٽان ۽ نيوٽران جو تعداد هڪ جيترو هوندو آهي جهڙوڪ ڪاربان (C^{12}) جنهنجي
مرڪز ۾ 6 پروٽان ۽ 6 نيوٽران ٿيندا آهن، پر گهڻن عنصرن جي ائٽم جي مرڪز
۾ پروٽان گهٽ ۽ نيوٽران وڌيڪ هوندا آهن. جيئن ته سوڊيم جي مرڪز ۾ 11

پروٽان 12 نيوٽران ٿين ٿا. ائٽم جو جملي وزن مرڪز جي ڪري آهي ڇاڪاڻ ته وزن دار بنيادي ذرا يعني پروٽان ۽ نيوٽران مرڪز ۾ ئي موجود هوندا آهن. ”مرڪز ۾ پروٽان جي تعداد کي عنصر جو ائٽمي نمبر چوندا آهن.“

مرڪز ۾ پروٽان ۽ نيوٽران جي جملي تعداد کي ائٽمي ماس نمبر چوندا آهن جنهن کي غلطي کان ائٽمي وزن به چيو ويندو آهي. ڪنهن به عنصر جي سڀني ائٽمن ۾ پروٽان جو تعداد هميشه ساڳيو هوندو آهي تنهن ڪري هر عنصر جو ائٽمي نمبر مخصوص هوندو آهي. مثلاً پارو ۽ سون به مختلف عنصر آهن. پاري جي مرڪز ۾ 80 پروٽان آهن يعني ان جو ائٽمي نمبر 80 آهي. سون جو ائٽمي نمبر 79 آهي يعني سون جي ائٽم جي مرڪز ۾ 79 پروٽان آهن. جيڪڏهن ڪنهن به طرح سان اهو ممڪن هجي ته پاري جي مرڪز مان هڪ پروٽان ڪڍي ڇڏجي ته پوءِ پاري مان سون ٺهي پوندو.

عام طرح سان ڪيميائي عمل ذريعي ائين ڪرڻ ناممڪن آهي. البت اهڙا خاص طريقا ڳولي لڌا ويا آهن، جن جي ذريعي ائين ڪرڻ ممڪن ٿي پيو آهي. پر اهڙي عمل دوران ايتري ته گهڻي توانائي ڏيڻي پوندي يا خارج ٿيندي، جنهن جو اندازو ائٽم بم مان لڳائي سگهجي ٿو. هن قسم جي توانائي کي نيو ڪليئر يا ائٽمي توانائي چئبو آهي، جنهن کي نه صرف جنگ ۾ پر امن جي وقت عام ڀلائيءَ لاءِ به استعمال ڪري سگهجي ٿو. جهڙوڪ ائٽمي بجلي گهر.

سج ۾ بي انتها ۽ اڻ کٽ توانائي آهي. ان جو راز به اها ئي ائٽمي توانائي آهي. سج اندر ٻن قسمن جا عمل ٿيندا رهندا آهن. هڪڙو ٻن هائڊروجن ائٽمن جي مرڪزن جو پاڻ ۾ ملي هڪ ٿيڻ، جنهن عمل دوران هائڊروجن مان هيليم ائٽم ٺهن ٿا ۽ پڻ هيليم جا مرڪز ٺهي ٿا هائڊروجن جي ائٽمن ۾ تبديل ٿين ٿا. انهن ٻنهي عملن دوران جيڪا توانائي خارج ٿئي ٿي، اها ئي اصل راز آهي سج جي توانائيءَ جو. جيئن مٿي بيان ڪيو ويو آهي ته پاري مان سون ٺاهڻ ممڪن ٿي پيو آهي، پر انهيءَ عمل تي خرچ ايترو ته گهڻو ٿئي ٿو جو ان لاءِ هي چوڻي صحيح ثابت ٿئي ٿي ته ”لوڻي کان ڳرو اپهڻ“.

اهو ضروري نه آهي ته ڪنهن به عنصر جي سڀني ائٽمن جو ماس نمبر ساڳيو هجي (ائٽمي نمبر جي برعڪس جيڪو هميشه ساڳيو هوندو آهي). جيڪڏهن ساڳئي عنصر جي ائٽمن جو ماس نمبر مختلف هوندو ته پوءِ اهو نيوٽران جي تعداد جي گهٽ وڌائي ڪري ٿيندو. پر پروٽان جو تعداد ساڳيو ئي رهندو. ڪنهن عنصر جا

اهڙا ائٽم جن جو ماس نمبر مختلف آهي، تن کي آئسوٽوپس چئبو آهي. مثلاً هائڊروجن جا ٽي آئسوٽوپ آهن جنجا نالا آهن:

(١) پروٽيم (٢) ڊيوٽيريم (٣) ٽرائٽيم

هنن ٽنهي جي مرڪز ۾ هڪ پروٽان هوندو آهي، پر نيوٽران جو تعداد مختلف آهي. پروٽيم ۾ هڪ به نيوٽران نه آهي، صرف هڪ پروٽان آهي، تنهن ڪري هن جو ماس نمبر هڪ آهي. پروٽيم کي عام هائڊروجن به چئبو آهي. ڊيوٽيريم جي مرڪز ۾ هڪ پروٽان کان علاوه هڪ نيوٽران به ٿيندو آهي جنهن ڪري ان جو ائٽمي ماس نمبر ٻه آهي. ڊيوٽيريم کي ڳري هائڊروجن به چئبو آهي. ٽرائٽيم جي مرڪز ۾ هڪ پروٽان کان علاوه ٻه نيوٽران ٿيندا آهن، جنهن ڪري ان جو ائٽمي ماس نمبر ٽي آهي. هر هنڌ هائڊروجن جا ٽئي آئسوٽوپ هڪ خاص نسبت ۾ هوندا آهن. عام هائڊروجن يا پروٽيم جا ائٽم تمام گهڻا ٿيندا آهن، ڊيوٽيريم جا ائٽم تمام ٿورا ۽ ٽرائٽيم جا ائٽم تمام ٿورا ٿيندا آهن. انهن جو سراسري ماس نمبر 1.008 a. m. k آهي، جنهن کي هائڊروجن جو ائٽمي وزن چئبو آهي. ڪن ٿورن عنصرن کانسواءِ تقريباً سڀني عنصرن جا هڪ کان وڌيڪ آئسوٽوپ ٿيندا آهن.

٢- مرڪز جي چوڌاري چڪر هڻندڙ اليڪٽران:

جيئن اسان جي ڌرتي ۽ ٻيا گره پنهنجي محور تي به ڦرن ٿا ته ساڳئي وقت سج جي چوڌاري به گردش ڪن ٿا، بلڪل اهڙي طرح اليڪٽران به پنهنجي محور تي ڦرن ٿا، جنهن کي Spin motion چئجي ٿو. ته ساڳئي وقت مرڪز جي چوڌاري به چڪر هڻندا رهن ٿا. اهي چڪر جن مدارن ۾ هڻن ٿا تن کي شيل Shell به چئجي ٿو. مدار وري ننڍن مدارن يعني Sub-shells ۾ ورهايل آهن جيڪي وري مدارچن ۾ تقسيم ٿيل آهن جن کي Orbitals به چئبو آهي جن جو تفصيل هيٺ ڏجي ٿو:-

مدار (Shells):—

ڪنهن به ائٽم ۾ ڪيترائي مدار ٿي سگهن ٿا جن کي 1 کان وٺي n تائين نمبر ڏنا ويندا آهن جتي n جي ڪابه قيمت ٿي سگهي ٿي پر عام طرح اها وڌ ۾ وڌ 7 لکبي آهي مدارن تي نالا پڻ رکيل آهن جهڙوڪ:

مدار جو نالو: K L M N O وغيره
مدار جو نمبر: 1 2 3 4 5 وغيره

وڌ کان وڌ اليڪٽران: 2 8 18 32 50 $2n^2$

مدار وري ننڍن مدارن Sub-shells ۾ ورهايل آهن.

ننڍا مدار (Sub Shells):

ڪنهن به مدار ۾ ننڍن مدارن (Sub Shell) جو تعداد جو حساب ڪجهه هئين آهي ته جيڪو مدار جو نمبر هوندو ان ۾ اوترا ننڍا مدار هوندا آهن ۽ انهن جو وڌ کان وڌ تعداد چار ٿيندو آهي ننڍن مدارن تي هي نالا رکيل آهن جهڙوڪ:

ننڍي مدار Sub Shell جو نالو:	s	p	d	f
ننڍي مدار Sub Shell جو نمبر:	0	1	2	3
وڌ کان وڌ اليڪٽران جو تعداد:	2	6	10	14

پهرين مدار ۾ هڪ ننڍو مدار 1S ٿيندو آهي

ٻي مدار ۾ ٻه ننڍا مدار 2S ۽ 2p ٿيندا آهن

ٽئين مدار ۾ ٽي ننڍا مدار 3S 3p ۽ 3d ٿيندا آهن

چوٿين مدار ۾ چار ننڍا مدار 4S 4p 4d ۽ 4f ٿين ٿا

پنجين مدار ۾ چار ننڍا مدار 5S 5p 5d ۽ 5f ٿين ٿا.

۽ ٻيا مدار به اهڙي طرح سان ورهايل آهن.

مدارچا (Orbitals):

ننڍا مدار يا سب شيل مدارچن ۾ ورهايل آهن اهڙي طرح جو:

S ننڍي مدار ۾ هڪ مدارچو ٿيندو آهي جنهن کي S مدارچو چوندا آهن.

p ننڍي مدار ۾ ٽي مدارچا آهن جن کي p_x p_y ۽ p_z چئبو آهي.

d ننڍي مدار ۾ پنج مدارچا آهن جن کي d_{xy} d_{yz} d_{zx} $d_{x^2-y^2}$ d_{z^2}

f ننڍي مدار ۾ ست مدارچا آهن جن جو تفصيل عام طرح سان ڪتابن ۾ نه ٿو ملي.

هر مدارچي ۾ وڌ کان وڌ ٻه اليڪٽران سمائجي سگهن ٿا.

ڪنهن به مدار ۾ ننڍن مدارن، مدارچن ۽ اليڪٽران جي وڌ کان وڌ تعداد جو هيٺئن ڪري سگهجي ٿو:

فرض ڪريو ته مدار جو نمبر n آهي ته پوءِ ان ۾ n ننڍا مدار، n^2 مدارچا ۽ $2n^2$ اليڪٽران ٿيندا. اها ڳالهه هيٺ ڏنل چارٽ مان وڌيڪ سمجهي سگهجي ٿي.

مدار جو نالو	n مدار جو نمبر	ننڍن مدارن جو تعداد	n^2 مدارچن جو تعداد	اليڪٽران جو وڌ کان وڌ تعداد
K	1	1	$1^2 = 1$	$2 \times 1^2 = 2 \times 1 = 2$
L	2	2	$2^2 = 4$	$2 \times 2^2 = 2 \times 4 = 8$
M	3	3	$3^2 = 9$	$2 \times 3^2 = 2 \times 9 = 18$
N	4	4	$4^2 = 16$	$2 \times 4^2 = 2 \times 16 = 32$

مٿي ٻڌايل مدارچن کانسواءِ ڪڏهن ائين به ٿيندو آهي جو هڪ ئي ايٽم جا ٻه يا وڌيڪ اهڙا مدارچا جن جي توانائي ۾ ٿورو فرق هجي پاڻ ۾ ملي نوان مدارچا ٺاهين ٿا جيڪي هر لحاظ کان هڪ جهڙا ٿين ٿا. اهڙن نون مدارچن کي هائبرڊ مدارچا (Hybrid orbitals) چئبو آهي. مدارچن جو اهڙو ميلاپ گهڻن ئي قسمن جو ٿي سگهي ٿو. مثلاً sp^3، sp^2، sp، dsp^2، d^2sp^3 هائبريڊائزيشن وغيره جن جو تفصيل هنن صفحن ۾ نه ٿو ڏئي سگهجي.

انکان علاوه ٻن مختلف ائٽمن جا مدارچا پاڻ ۾ ملي نوان مدارچا ٺاهين ٿا جن کي ماليڪيولي مدارچا چئجي ٿو جن جي نتيجي ۾ ميلاپ ٿي ويندو آهي ۽ ماليڪيول ٺهندا آهن. اهڙن مدارچن کي ماليڪيولي مدارچا چئبو آهي.

مٿي ذڪر احوال ۾ گهڻن ئي قسمن جي مدارچن جو ذڪر ڪيل آهي جن جو تفصيل ته هتي نه ٿو ڏئي سگهجي البت مدارچن جي قسمن جو اختصار هيٺ چارٽ ۾ ڏجي ٿو.

(چارٽ صفحي ٢٠ تي ڏسندا)

Orbitals مدارچا

- ائٽمي مدارچا (هڪ مرڪز کي گهيرينداڙ)
  - خالص (Pure)
    - جهڙوڪ: S, px , py, pz , dxy, dyz, dzx, d(x2-y2), dz2 وغيره
  - ملاوٽي (Hybrid)
    - جهڙوڪ: Sp^3, Sp^2, Sp, dsp^2, d^2sp^3 وغيره
- ماليڪيولي مدارچا (ٻن مرڪزن کي گهيرينداڙ)
  - سگما (6)
    - 6 سگما (Bonding)
    - 6* سگما اسٽار (Anti bonding)
  - پاءِ (π)
    - π پاءِ (Bonding)
    - π* پاءِ اسٽار (Anti bonding)

دين محمد شيخ
ليڪچرار حيوانات
گورنمينٽ ڊگري ڪاليج لطيف آباد

صبح بهار

جڏهن گرميءَ جي شدت کان زمين تپندي آهي ۽ سج جي تيزي ان جي رڳ رڳ مان زندگي جي علامت چوسي وٺندي آهي. آسمان جا الا ساريءَ فضا کي ڌاندن وانگر دکائي ڇڏيندا آهن. گل ڪومائجي ويندا آهن. مکڙين جي ڳچين جا مڻڪا ڀڄي پوندا آهن. ڪن جو رنگ اڏامي ويندو آهي. وڻن جا ان ۽ شاخون سڪي ويندون آهن. ٻاهر ٻوٽا خشڪ ٿي ويندا آهن. جنگل جي جانورن کي آسماني شعلن کان ڪٿي به پناه نه ملندي آهي. پکي پنهنجن آکيرن ۾ نرم ۽ نازڪ زبان ڪڍي بيحال ڪريا پيا هوندا آهن. انسان زندگي ۽ ان جي تمام خوشين ۽ لذتن کان مايوس ٿي پوندو آهي. هاري پنهنجي زمين جي ڪناري بيهي آس ڀرين اکين سان آسمان کي تڪيندو آهي ته ڪٿان ڪو انهن اکين جي ٺارڻ جو سامان نظر اچي، پر سندس اکيون ناڪام ۽ نامراد دل جي ويراني ۾ موٽي اينديون آهن.

اهڙي طرح زمين جي ڪنهن به حصي تي زندگيءَ جي نمي باقي نه رهندي آهي ڪٿي به زندگيءَ جي تازگي ڏسڻ ۾ نه ايندي آهي. تڏهن آس ۽ نراس جي انتهائي عالم ۾ جا ڪڪر آسمان تي ڇانئبا آهن ٻلر جي پالوٽ سان زمين جي دامن کي ڀري ڇڏيندا آهن. جنهن سان مرده زندگيءَ کي تازگي ملندي آهي ڪائنات جي رڳن ۾ وهڪرو وري موٽي ايندو آهي. فضا جي سيني ۾ رڪيل ساه وري هلڻ لڳندا آهن. تڏهن جوش خشڪ اکيون زندگيءَ جي شراب جي ڇلڪندڙ پيمانن ۾ تبديل ٿي وينديون آهن. ڪومايل گلن ۾ نئين سر تازگي ۽ شگفتگي اچي ويندي آهي. تڏهن هوائن جا نازڪ ۽ لطيف جهونڪا سر سبز ۽ شاداب وڻن جي شاخن ۾ لچڪ ۽ گلن ۾ مدهوشي پيدا ڪندا آهن. مطلب ته هر طرف هڪ نئين ۽ تازي زندگي هڪ اهڙي جهومندڙ ۽ مسڪرائيندڙ جنت نگاه ۾ بدلجي ويندي آهي جنهن ۾ هرطرف خوشين جا دريا اڀامندا ۽ ٽهڪن جا گل ڦٽندا نظر ايندا آهن.

وهو الذي يرسل الرياح بشرا بين يدي رحمته حتى اذا اقلت سحابا ثقالا سقناه لبلد ميت فانزلنا به الماء فاخرجنا به من كل الثمرات (٧-٥٧)

معنيٰ:- ۽ اهوئي آهي جيڪو هوائن کي موڪلي ٿو ته اڳيان سندس رحمت جي خوشخبري ڏيندڙ ايستائين جو جڏهن بادل ڳرا ٿي پيا ته اسان انهن کي انهي مرده شهر ڏانهن هلايو. پوءِ انهن مان پاڻي لاٿو، پوءِ ان مان طرح طرح جا ميوا ڪڍيا.

اڄ کان چوڏهن سو سال اڳ عالم انسانيت جي خشڪ سالي ان کان به وڌيڪ سخت هئي. ان وقت زندگيءَ جي وڻ جي هر شاخ جو پاڻي سڪي چڪو هو. تهذيب ۽ تمدن جا گل وحشت ۽ بربريت جي گرم هوا مان مرجهائجي ويا هئا. سٺن عملن جا زندگي بخشيندڙ چشما بلڪل تباهه ٿي چڪا هئا. زمين تي انسانيت جو نالو نشان به باقي نه هئو. اهڙي وحشت جي عالم ۾ مايوس ۽ نامراد انسان هيڏي هوڏي ڀٽڪندو هو پر خدا جي ايڏي وسيع زمين تي ان کي ڪٿي به زندگيءَ جي تازگي جو نشان نه ملندو هئو. چئني طرف مايوسي ۽ نا اميدي ٿي. سندس اکيون ڪڏهن ڪڏهن آسمان طرف اٿنديون هيون ۽ ڪارينديون هيون: متيٰ نصر الله (الله جي طرفان فتح ڪڏهن ايندي) ۽ اهو ئي وقت هو ته فطرت جو اٽل قانون انهيءَ ڏک ۽ ڪمزوريءَ کي تازگي ۽ شگفتگيءَ ۾ بدلي ڇڏي.

وهو الذي ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته (٤٢-٢٨)

معنيٰ:- ۽ اهوئي آهي جيڪو مينهن کي لاهي ٿو انهن جي نا اميد ٿيڻ تي ۽ پنهنجي رحمت کي ڦهلائي ٿو.

اهڙيءَ طرح رب العزت جي خاص روشني پنهنجي آغوش ۾ زنده اميدن ۽ تابنده آرزوئن جون هزارين جنتون کڻي ربيع الاول جي مقدس مهيني جي ١٢ تاريخ ۽ سومر جي مبارڪ ڏينهن تي فاران جي چوٽين تي لٿي جنهن سان انسانيت جا مرجهايل گل جهومي اٿيا. اخلاق ۽ تمدن جي ڪمزور نصان تي وري بهار آئي. صالح عملن جا سڪل چشما نئين زندگي جي وهڪري ۾ تبديل ٿيا. ڪائنات جي فضا خوشيءَ جي نغمن سان گونجي وئي انسان کي نئين زندگي ۽ زندگي کي نئون ولولو عطا ٿيو.

يا ايها الناس قد جاءتكم موعظة من ربكم وشفاء لما في الصدور وهدي ورحمته للمؤمنين O

ترجمو:- اي انسانو! توهان وٽ پروردگار جي طرفان هڪ اهڙي شيءِ آئي آهي جيڪا عزت واري آهي، ۽ دل جي تمام بيمارين لاءِ شفا آهي ۽ هدايت ۽

رحمت آهي جيڪي (ان تي) ايمان رکن ٿا.

محمد صاحم آيو ته دنيا مان طاغوتي قوتن جا تختا اونڌا ٿي ويا جو سندن ۽ قيصريت لاءِ فنا جو پيغام هئو. ايران جا آتشڪدا ٺڏا ٿي ويا جو تصور جي دنيا نار (باهه) بدران نور سان ڀرجي وئي. دنيا جي بت خانن جا ٿي ويا جو اڄ ابراهيمي مسلڪ جي پوري ٿيڻ جو وقت اچي ويو. وچي منهن هنيو جو اڄ ڏاڍ ۽ ظلم جي هر طاغوتي قوت جي لڪن ۾ دنيا مان گمراهيءَ جي اونده ختم ٿي وئي جو اڄ هڪ اهڙي ويو. ٿيو جنهن کي خود موڪلڻ واري ”روشن چراغ“ سڏيو.

يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا ونذيرا وداعيا الي الله باذنه وسراجا منيرا.

اي نبي! بيشڪ اسان تو کي شاهد ۽ خوشخبري ڏيندڙ ۽ ڊيڄاريندڙ ۽ الله ڏانهن سندس حڪم مطابق سڏيندڙ ۽ روشن چراغ ڪري موڪليو.

مطلب ته سندن ڪري اچڻ ڪري اهي سموريون زنجيرون جن ۾ انسانيت جڪڙيل پيون. نسلي، جاگرافيائي، وطني ۽ غير فطري معيار جن انسانن کي ٽڪرين ڇڏيو هئو هڪ هڪ ڪري ختم ٿي ويا ۽ انسان زمين تي ڀهر ڪنڊ ٿي جي قابل ٿيو. انسان کي پنهنجي منزل ماڻڻ لاءِ سڌي راه (صراط المستقيم اچڻ وارو رسول ڪافته الناس (سمورن انسانن لاءِ) ۽ رحمته اللعالمين (سمورن لاءِ رحمت) بنجي آيو هو ۽ پاڻ سان هڪ اهڙو عدل ۽ انصاف جو نظام کڻي جيڪو انسان کي سموري دنيا جي غلاميءَ کان نجات ڏيڻ جو سبب بڻيو. ڪو نئون پيا انوکو نه هيو نه ئي وري سندن صه تعليم ڪا نئين تعليم ڏني جي به هئي انهيءَ ڇپي ڪتاب جو ڪو نه ڪو صفحو هيو جيڪو محمد عربي ذريعي دنيا کي مليو. روشني جنهن به هنڌ هئي انهيءَ آساني ڏني جو ڪو ڪرلو هئو جيڪو قلب نبويءَ ۾ روشن ڪيو ويو. نتيجي ۾ انسان جيڪي شاخن وانگر الڳ الڳ هئا هاڻ وڻ وانگر مضبوط ٿيا. اڳ ننڍين ننڍين ورهايل هئا ۽ هاڻ ملت جي ڏاڳي ۾ پوئجي هار جي شڪل ۾ پريا.

خلق و تقدير و هدايت ابتدا است
رحمته اللعالمين انتها است

پيغام محمدي دنيا ۾ پهريون ۽ آخري پيغام آهي جيڪو ڪاري، گوري، عجمي، سڀ لاءِ عام آهي. جوڙي طرح خدا رب العالمين (تمام جهانن جو

Princ

&

Teac

wi

Prize W

Principal

with

Office Staff,

Ministerial

بالشهار) آهي اهڙيءَ طرح رسول صه ۾ رحمتہ اللعالمين (تمام جهانن لاءِ رحمت) آهي جيستائين سنڌس سلطنت آهي ايستائين سندن پيغمبري آهي.

قل ياايهاالناس اني رسول الله اليكم جميعا نالذي له ملڪ السماوات والارض

ترجمو: (اي نبي) چئه ماڻهن کي تہ تون سڀن ڏانهن الله جو رسول آهين جيڪو آسمانن ۽ زمينن جو مالڪ آهي.

ان پيغام ذريعي خداءِ والجليل کي پنهنجن بندن کي جيڪي ڪجهہ چوڻو هو آخري دفعو چئي ڇڏيو. انسان جي اشرف بڻجڻ لاءِ جيڪي قائدا قانون ڏيڻا هئا سي انتهائي شڪل ۾ ڏنا ويا ان ڪانپوءِ انسان کي پنهنجي منزل مقصود ڏي پهچڻ لاءِ لاءِ ڪنهن ٻئي راهہ جي ضرورت باقي نہ رهي. هاڻ انسانيت جي بلند مقام تي پهچڻ اهائي هڪ صراط مستقيم آهي جنهن تي ان مقدس هستيءَ جي قدمن جا مبارڪ نشان چمڪي رهيا آهن.

ان الله وملائڪته يصلون علي النبي

ياآيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما

Gymkhana Committee

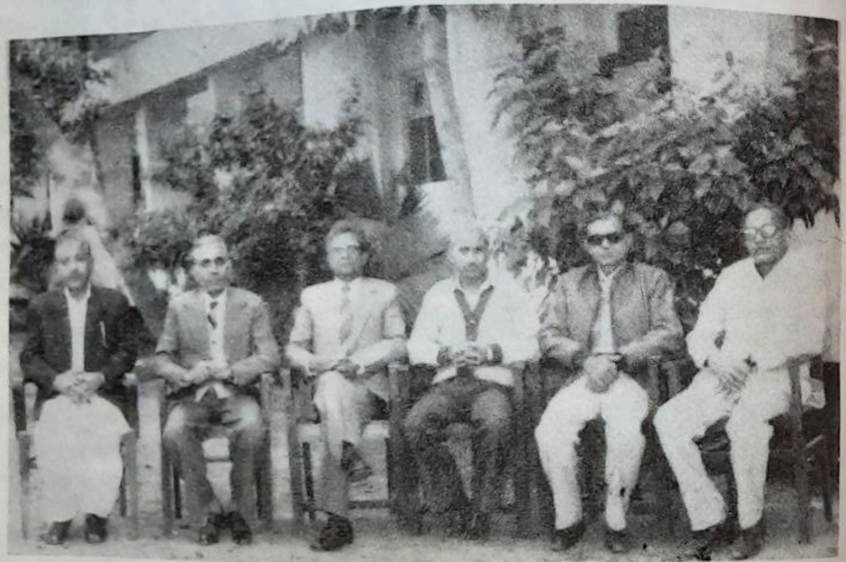

Discipline Committee

TEACHERS

BUSY IN LAB

Principal & Teachers with Prize Winners

Prof: Shafi Raza

Supervising Practicals

as the rulers of half of the known world including India. They spread all over the world for preaching Islam, the final message of Allah. How could they surrender before sheer injustice, more wickedness, open vileness, unfair behaviour haenous character and before dirty politics.

They had fought for centuries for the restoration of the rights of all the weak but just people in the world. How could they not stand up to fight for their own survival while life is a sacred trust of Allah with every Muslim. The Muslims could not leave themselves at the mercy of those who had, beyond any doubt, exposed themselves when authority had come into their hands for a short period of 2 years and four months in 1937 after the first provincial general elections in July 1937 were held according to the federal constitution of 1935. The Congress governments in various provinces left no opportunity unavailed to discourage Islam, Urdu and the Muslims. Anything which belonged to the Muslims whether a mosque or an animal was harmed, damaged and destroyed. Environment was made suffocating for the Muslims. Violence ruled everywhere against the Muslims.

Rotis were organised to kill thousands of Muslims Hindi and Hinduism were forcefully taught to the Muslim childern. The sectarian and agonising Hindu an them "Bande Matarm" was officially sung and played. The Muslims were slaughtered on slaughtering the cow. Pipes and timbrels were played on in front of mosques at the time of Nawaz Congregation. Crimes were committed by the Hindus while cases were registered against the Muslims. In such circumstances, why could the Muslims not decide to construct walls of defence for their national safety? How could they adhere to the policy of cooperation, co-existence and unity with the Hindus while their own existence was obviously jeopardised by the Hindus.

The muslims were perfectly right when the demanded a separate homeland in 1940, soverign and independent to anable them to pass their lives according to the commandments of Allah and His Holy Prophet Muhammad (peace be upon him).

Pakistan was to become the land of piety, contant, patience, tolerance, love, effection, sympathy, co-operation, goodness, truth, honesty, purity, generosity, selflessness, sacrifice, liberty, equality and fratermity all in the light of the teachings of Islam, so the Muslims of the sub-continent clustered round the Quaid-e-Azam who led his nation wisely achieve the noble aim.

EVERY ACTION HAS A REACTION. The action of the Hindus to harm Islam in India produced the reaction of the Muslims to protect Islam. They struggled vigorously with unity, faith and discipline under the banner of the All-India Muslim League led by the Quaid-e-Azam and achieved Pakistan, where, Quran and Sunnah should rule supreme.

إن الدين عنداللہ الاسلام

Islam Zindabad   Pakistan Paindabad.

At the Eve of Prof: Y. A. KHOKRAS, Fare - Well

Prof: Aftab Ahmed Khan Director Addressing College Staff

Prof: Y. A. Khokra, Ex-Director. with the Gathering.

East Bengal become a seperate province having a Muslim majority. The Congress the Hindus, not only of Bengal but of whole of India; roughly and rudely protested inst the partiton because they understood that East Bengal could be conducive to welfare, progress and prosperity of the generally poor and backward Muslim pop tion which had ruthlessly been exploited by the Hindu Land-Lords and capitalists. long time. At last, under the pressure of Hindu agitation the British government re the divided Bengal in 1911. The Muslims were bound to contemplate over their modus-operandi for a safe furture. The had only two alternatives (1) either to get rights recognised by the Hindus or (2) to keep away and separate from the Hindus.

The Khilafat Movement had shaken the foundation of the British auth over India and it was apparent that they would liberate India by 1922. But, when lana Muhammad Ali Johar was yet behind the bars, Gandhi irrationlly retreated off the Non-cooperation Movement of the Congress as well as to stop the Khilafat M ment. Thus the pains taken by the Khilafat Leadership went in vain. Gandhi deli by delayed the independence of India because he wanted that the people must not the impression that India had won freedom with the help of the force, vigour and p of a Muslim Movement.

The spirit of unity which was enhanced by the efforts of the Quaid-e-A in 1916 was hampered and damaged and was not adequately valued by the Cong Leaders who wanted to monopolise Indian politics. In 1928, quite contrary to the p sions of the Lucknow Pact, Pandit Motilal Nehru, in his Nehru Report, rejected the of separate elections for the Muslims. He proposed unitray government for the co and did not guarantee the protection of the rights of the Muslims. Such was the neg attitude of the Hindus towards the Muslims in Indian politics which increased the an of the Muslims about their future all the way.

The Round Table Conferences proposed by the Quaid-e-Azam and held by British government in London could not bear any fruit due to the traditional inflexi and rigidity of the Congress Leaders who stuck to their own plans of purely Hindu ernment in an independent India. They allowed no concessions to the Muslims.

At last, Allama Iqbal, who had once said:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہندی ہیں ہم' وطن ہے' ہندوستاں ہمارا

reformed his thought and said:-

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم' وطن ہے' سارا جہاں ہمارا

and he proposed. in his presidential address in the Allahabad session of the All-India Muslim League in 1930, that the Muslims should have a separate homeland of their own the could, without any hindrance and external interference, freely pass their lives obeying the commandments of Allah and his Holy Prophet Muhammad (peace be upon him) for which purpose they are born.

Earlier in 1929, the Quaid-e-Azam had once more tried to show the right path to the Congress Leadership by reminding through his famous fourteen points that if at all the Hindus were sincere in believing in natual co-existence with the Muslims they should accept the rights of the Muslims.

Till when the Muslims could go on showing patience? They were being denied even the right to live. EVERY THING HAS A LIMIT. At first, the Muslims individually expressed their opinions that living with Hindus in a United India was quite impossible due to the narrow-mindedness of the Hindus,, then came the ripe time in 1939, for the Muslims to declare collectively that they could not live anymore with the Hindus. For the sake of Hindu-Muslim unity the Muslims had suffered and sacrificed a lot. But if the Hindus were not ready to consider the Muslims equal Hindustanis; If the Hindus were not ready to recognise the rights of the Muslims to live a safe and respectable life in India. If the Hindus could organise militant armed youth under the banners of the Rashtriya Sevak Sangh, the Arya Samaj etc to massaore the Muslims. If the Hindus could call the Muslims "maleechh" and insult their saints and other forefathers; If the Hindus could born their mosques and the Holy Quran; If the Hindus could demolish or occupy the mosques, houses, shops, farms etc of the Muslims; If the Hindus could openly demand that the Muslims should either leave India or convert to Hinduism or be killed; If the Hindus could unite and work to force the Muslims to surcender mentally, physically socially, economically, politically and religiously befor the Hindus; If the Hindus could plan to block the path of prosperity for the Muslims; If the Hindus could close the doors of education, employment commerce, agriculture, industry and political representation upon the Muslims ONLY BECAUSE THE MULLIMS WERE MUSLIMS!: Then the Muslims could also wake up and rise to unite like their gallant and virile ancestors to foil the evil designs of the not only apponent but historically inimical Hindus. The Muslims ultimately declared that they could net give their furture into the hands of the persecuting, cruel, prejudiced and fanatic Hindus.

Thomas Hobbes says in his Leviathan (1651) "The first and the foremost law of nature is to seek peace and follow it" so do the Muslims believe. Islam is a religion of peace, a religion of complete submission to Almighty Allah and his Holy Prophet Muhammad (peace be upon him). They do not surrender before any worldly power or pressure though they are ever ready to make peace with all who desire to make friends with them for good. They bow before Allah only and then live virtuously, piously, truthfully, honestly, and bravely with honour. They have set examples of justice and equality

Muhammad Hafeez Qureshi
Assistant Prof: of Political Science
Govt: Degree College Latifabad Hyd.

ACTION AND REACTION

There was a time when the Muslim leaders of South Asia not only belie[ved] in Hindu-Muslim unity but also preached it. They devoted themselves to this cause w[ith] worked honestly for it, particularly, during the period from mid-ninteenth century to t[he] beginning of the fifth decade of the twentieth century. Their earnest efforts were direct[ed] towards achieving the aim of liberating the sub-continent of South Asia from the yo[ke] of the Britishers, howso-ever.

The Muslims writers of that age wrote to bring the two major nationaliti[es of] the sub-continent closer together. They were proud of calling themselves 'Hindi'. Sir Sy[ed] Ahmed Khan, the pioneer of modern Urdu prose, taking Hindus in association, strove [to] spread modern education and scientific knowledge in the country.

Dr. Sir Muhammad Iqbal, 'the poet of the East' composed verses in favour [of] "Hindi" nationalism in his youth. He was so enthusiastic as to say:-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

Maulana Syed Suleiman Nadvi argued that since Urdu is the language of the Hindustanis, so it should be perferably renamed as "Hindustani'.'

The Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, was called the "Ambassador of Hi[ndu] Muslim Unity" when he succeeded in bringing the Indian National Congress and the [All] India Muslim league closer to each other through the famous "Lucknow Pact" signed [by] the two parties in 1916 as a result of his personal endeavours only. Again, he was [the] only man in the political field of the sub-continent, who was the most moderate, logi[cal] and rational in his political thought and practoce, when in 1929 he reminded the cong[ress] leadership of the fact that if it denied legitimate and fundamental human rights to [the] Muslims, it would eliminate the possibility of peaceful co-existence of the two commu[nities] ties in the sub-continent for ever

One of the great leaders of the Muslims, Maulana Muhammad Ali Johar, [who] steered the powerful Khilafat Movement from 1919 to 1924, with the aim of safe-guar[ding] the historical Islamic institution of Khilafat in Turkey the symbol of universal Muslims unity practically co-operated with the congress Leadership in weakining the British goverment in the sub-continent. He went to the extent of allowing Mohandas Karamchand Gandhi to make the most of the Khilafat movement in the interest of the freedom of the deoples of India.

Further, the Quaid-e-Azam proposed to the British Prime Minister to hold the famous Round Table Conferences in London from 1930 to 1932, in order to provide a chance to all the sections of the population of South Asia to reach some agreement on basic constitutional issues eg adequate representation, type of election, system of government etc, so that they might remain united in future, even after the independence of their country.

The thinking of the Muslim Leaders continued to be positive and clear from the beginning to the end. They tried for Hindu-Muslim unity honestly and contributed to it on all occasions but they experienced the unexcepted at all stages; The Hindus were planning differently. They were quite indifferent towards and disinterested in Hindu-Muslims unity. They conspired and plotted not to behave equally with the Muslims but to ensalve them when the British left. The Hindus were over-confident to rule a democratic India with their over-whelming country wide majority. They knew no rights of the Muslims. They did not recognise any rights of the Muslims. They dissented to think 'n the interest of the Muslims.

The Urdu-speaking Hindu friends and companions of Sir Syed Ahmed Khan stunned him by sentimentally, enthusiastically and materially participating in the anti-Urdu movement in 1867 because they believed that Urdu was a 'Muslim League, due to its Persian and Arabic vocabulary and Persian script. He came to the conclusion that it was futile to expect that the Hindus would respect the rights of the Muslims when they were not ready even to tolevate Urdu, the language introduced and developed by the Muslims-though, spoken written and understood by all from this end to that end of South Asia. He was greatly disappointed. This disappointment compelled him to think on the lines of protecting the religious, cultural as well as political and economic rights of the Muslims. He rejected the British ideas of introducing the European democracy in India on the plea that because in democracy the majority rules so in democratic India there would be perpetual rules of the Hindus who were in a majority. Democracy could be successful only where there lived one type of people as the British did in Britain It could only be a failure in a multi-nation country like South Asia which was populated by the two nations-the Hindus and the Muslims. He suggested that the Muslims should be cautions of the designs of the Hindus and should keep away from the Hindu-dominated Indian National Congress founded in 1885.

The fraternizing Muslim Community seffered a serious blow again from the Hindus and their Congress in 1911. Bengal, tqe largest province, was partitioned by the British Government to facilitate administration. As a result of the partition in 1905.

Miskeen Ahmed Mansoor
Asstt. Prof: of English

A Great Teacher-Greater Man

Dr. Muhammad Ahsan Farooqui is well known as a novelist, critic and short story writer. His novels are simple, beautiful and deep. His most popular novel is "Sham-e-Ovadh'.' In the opinion of an under critic he is the only one, among contemporary writers, who fully understands the art of ncvel. There is no exaggeration in saying that he "chewed and digested" all the great novels of the world. He wrote fine criticism, and as a critic his judgements are nature and fair. His book "Novel Kia Hay" is an example of fine critism and bears a witness that he fully knows the art of novel. His simple and realistic short stories grip the attention of a reader tightly from the begining to the end. A collection of his short stories "Af.ana Kar Dia" is a mirror of interesting events and characters. In this mirror many of us can see our face. He had wonderful powers of characterzation and the people who were close to him can easily recognise many of the Characters of his short stories. To-day he occupies a place among prominent urdu writers, but more than that he was a great teacher-greater man.

He was immensely loved and respected by his students. They loved and respected him from the core of their heart as a Murshad is adored by his Mureeds. He was an ocean of knowledge-vast, deep, majestic. Teaching was a worship for him. He taught his students with affection, sincerity and broad-mindedness. I can still see his similing face with my "mind's eye'.' He taught poetry, prose, drama and fiction with an equal interest and authority. The students quenched their thirst for knowledge from this spiring of clean and fresh waters. He delivered lectures in a simple and impressive language, quoting from different critics and giving his own opinion, bringing out before his students the salient features and important aspects of the writer and his works. T.S. Eliot's "The waste land" is one of the difficult poem in English, but he enplained it so clearly that many a student was able to comprehend it easily.

As a man he was simple, truthful and dutiful. His greatness lay in the simplicity and frankness of his character. The examples of such child-like simplicity are rare He could not hide his feelings. He talked about people, places and things exactly in the manner as he believed them to be. His tongue was a true companion of his heart and

there was no curtain between the two. He knew no hypocricy. Sometimes his true remarks equally alarmed his friends and foes. The friends worried for him and the ill-wishers were afraid of him. He very easily turned other against him by speaking the truth. He could not change himself according to the changing faces of society. He went on speaking the truth and as a result shifting himself from one place to an other. He taught English literature at the University of Karachi, the University of Sind and the University of Baluchistan.

He was as innocent as Carvente's Sancho Panza and was always ready to belive in the Don Quixotes of his time. He was rarely angry with any body. When some sperficially learned men talked against him with professional malice, he remained calm with a faint edge of angelic simle on his lips. When there was some things unhappy, unpleasement and unbearable, he quite peacefully extended the frontires of his tolerence."

He never claimed to be an intellectual and had no ambition to dominate others by his learning, though he was a Gulliver among the Liliputitians who could not observe and understand him at a glance. He lived in literature. His greatest pleasure were reading writing and teaching. He was a man who respected man-loved man.

24 RENE DUTROCHET (French 1776—1847)

He was a well known Histologist. In 1824 he announced that plants and animal were composed. of cells.

25. ROBERT BROWN (English 1773—1858)

A famous histology expert, who described nuclei in plant cells for first tim in 1833.

26. M. J. SCHEILDEN (German 1804—1881)

Put forth the thesis, in 1838, that cells were structural and physiological unit in plants.

27. THEODOR SCHWANN (German 1810—1882)

In 1893, he applied the thesis of Scheilden to the animals.

NOTE:-

Both Scheilden and Schwann together formulated the well known CELL THEORY which describe.

A) That cells are structural units of all living organisms.

B) That cells are functional units of all living organisms.

C) That cells are herditary units of all living organisms.

D) That new cells are formed from the division of pre-existing cells. This theory has one of the most fruitful of all biological concepts and is th basis of all understandings of the structures and functions with living organism

28. FATHER SUAREZ (Spanish 1548—1671)

Basically he was religions man. He is famous for his theory of special creatio which maintain that each kind of animal or plant came into existence in the form which it exists today and that it was specially designed to suit the conditions under whic it was placed.

29. CHARLES ROBERT DARWIN (English 1809—1882)

The greatest name in the history of Evolutionary thought. He profounded t theory of Evolution based on NATURAL SELECTION, in his famous Book 'the origi of species', in 1859.

30. GREGOR JOHANN MENDEL (Australian 1822—1884)

He is considered to be the father of Genetics (Science o heredity). He do the pioneer definitive work on genetics, which was published in 1866.

31. LOUIS AGASSIZ (Swiss 1807—1873)

He is the first, who initiated the present practice of dissection of specimens before and by the students. His docterine "STUDY NATURE NOT BOOKS" today is applied at all levels.

32. LOUIS PASTUER (French 1822—1895)

He discovered the principle of sterlization, the basis of distroyine micro-organisms by heat and chemicals.

¤¤¤¤

between sensory and motor nerves.

7. LEONARDO DA VINCI (Italian 1452-1519)

He was an engineer basically but was also a good painter. Due to the expertness in painting he draw the figures of human and animal body. Besides painting, he was also famous in beeing an anatomist and physiologist.

8. KONARD GESNER (Swiss 1516-1565)

He wrote HISTORIA ANIMALIUM of 5 volumes (over 3500 pages) the first illustrated work on zoology with many good figures.

9. GUILLAUMEROUDELET (French 1507-1566)

He published a book named "De-piscibus marinis" in french language, including all sorts of marine animals and the first figure of a dissected invertebrate.

10. ANDREAS VESALIUS (Belgian 1544-1564)

The great expert in Anatomy. He made original dissections and published ON THE STRUCTURE OF HUMAN BODY in 1543, containing the figures of skeleton & muscle in a better way than figures of Galen.

11. WILLIAM HARVAY (English 1578-1657)

He introduced the experimental methods in physiology. His researches dealt with the circulation of blood and pumping action of heart. He also described the embryology of chick and of some other lower forms. He defined the term PLACENTA in memmales too.

12. ROBERT HOOKE (English 1635-1703)

He was the first report the presence of cells in plants, while observing a piece of cork under a microscope in 1665.

13. MARCELLO MALPIGHI (Italian 1628-1694)

The real founder of micro-anatomy for both plants and animals. He described the finer anatomy of the lungs, liver, kindly and spleen and saw capillaries joining arteries and veins.

14. ANTONY VAN LEEUWENHOEK (Dutch 1632-1723)

Inventor of simple microscope (in 1676). Also he discovered blood corpuscles, spermatozoa, straited muscles, protozoans and rotifers.

15. JOHN RAY (English 1627—1705)

He was the first man, who advanced the plant classification.

16. CAROLUS LINNAEUS (Swadish 1707—1778)

He was considered as FATHER of TAXONOMY. He established a universal system of classification and nomenclatue with concise discriptions. For this he published a book SYSTEMA NATURE in 1735, which was a methodical catalogue of plants, animals and minerals arranged in larger and subsidiary groups. He also adapted the binomial no-menclature for first time in which each organism is designated by a generic (genus) and a specific (species) name.

17. KARL ERNST VON BAER (German 1792—1876)

He is thought as FATHER of EMBRYOLOGY. He established the germ-layer theory and introduced for first time the comparative study of embryos of different groups. For this purpose he wrote a book, viz: DEVELOPMENT of ANIMALS.

18. FRANCIS BALFOUR (English 1851—1882)

The great eminent embryologist than Baer. He published COMPARATIVE EMBRYOLOGY, in which the embryos of different groups were described in move better way than Baer

19. BARON GEORGES CUVIER (French 1769—1832)

A great anatomist, who established comparative anatomy as a new branch of biology. He was also the founder of Science of palaeontology.

20. H. MILNE-EDWARDS (French 1800—1885)

He introduced the idea of division of labour in a living organim-body and wrote in a methodical manner on comparative physiology & anatomy.

21. RICHARD OWEN (English 1804—1892)

The author of "Comparative Anatomy and physiology of vertebrates" in (03) volumes and the real developer of concepts of analogy and homology.

22. CHARLES LYELL (Scottish 1797—1875)

A great palaontologist who recognised the true nature of fossils for first time.

23. JEAN BAPTISTE LAMARCK (French 1744—1829)

A great and well known expert in Palaenotology and Evolution. He did more for invertebrate palaeontology that Cuvier had done for verterbrate. He was also the first to propose a general theory of evolution based upon the influences of invironment, the effects of use & disuse of organs and the inhertance of acquired characters.

so rich is its agriculture
Plenty of food is grown here
Tasty rice, corn and wheat fair
Pulses, barley and come-sugar,
So,
Toil for Pakistan, dear
Come, work for Pakistan.

Its stalwarts are bold and brave.
All of them free and none is slave
Their pretty country they can save
From every dirty for or knave.
So,
Live for Pakistan, dear,
Come, work for Pakistan.

My country; decent, nice and fine
Its of us all, its mine and thine
Let us strive to make it shine
For this end should we all conbine
So,
Preach for Pakistan, dear,
Come, work for Pakistan.

My Pakistan, my motherland
Its every thing is great and grand
Its my love, for it I stand
Whoever loves it, is my friend
So,
Kiss your Pakistan, dear.
Come work for Pakistan.

A few words more to Siemmarise
Its people are truthful and wise
My country is a paradise
May it prosper, progress and rise
So,
Pray for Pakistan, dear,
Come, work for Pakistan.

PAKISTAN ZINDABAD

Mr. Din Muhammad Sheikh
LECTURER IN ZOOLOGY
Govt. Degree College Latifadad.

EMINENT CONTRIBUTORS TO ZOOLOGY

1. ANAXIMANDER (Greek 611-547 B. C.)

Father of Biology who was first to beleive that living things arose from non-living contents of mud.

2. XENOPHANES (Greek Sixth Century B. C.)

He was first to recognise fossils as animal and plant remains and also told that the presence of marine fossils upon the mountains indicates that the mountains had once been below the Sea,

3. HIPPOCRATES (Greek 384-322 B. C.)

He was a great physician and writings show a high level scientific thoughts.

4. ARISTOTLE (Greek 382-322 B. C.)

He was the first and greatest Zoologist of the record and is cosidered as FATHER OF ZOOLOGY. Besides zoology he also wrote exclusively on philosophy, politics etc. He was the first to classify the animals into groups according to structure, habitat and habits. Chick embryology was also followed by him. Development of certain sharks in the uteri of mother and development of drone flies by parthenogenesis was first studied by Aristotle.

5. PLINY, THE ELDER (Roman 23-79 A. D.)

He comiled the Encyclopedia "NATURAL HISTORY containing 37 books. The encyclopedia included the topics relating to the all natural phenomena and their applications, wild & domestic animals, animal husbandry, medicine etc.

6. GALEN (Greek 13o-2oo A. D.)

He was a great physician and also was a great influential in physiology. He described various internal organs the blood vessels, brain and nerves. He also differentiated

alike, the sower in our hearts of the deep-laid seeds of our feelings and beliefs". The following lines beautyfully illustrate this ideas:-

One impluse from a vernal wood,
May teach you more of man,
of moral evil and of good,
Then all the sages can.

Wordsworth is not only the poet of Nature but also that of Man. He thinks that Man and Nature are interconnected and interrelated. The one cannot be separated from the other. In fact, Man is a part of Nature and it is love of Nature that leads to love of Man. Thus from the beauties of Nature, he turns, to the sufferings and troubles of mankind:

To her fair work did Nature link
The Human soul that through me ran
And much it grieved my heart to think
What man has made of man.

Muhammad Hafeez Qureshi
ASSISTANT PROFESSOR
Department of Pol: Science
Govt. Degree College. Latifabad.

COME WORK FOR PAKISTAN

Come, work for Pakistan, dear
Come work for Pakistan.
My Pakistan, a great country.
One day, the greatest it can be.
The gift of Allah Almighty
To Muslims, for their safety

So,

Love your Pakistan, dear
Come, work for Pakistan.

On Islam is its foundation
Thus, it is a Muslim nation.
Its each order, system, fashion
Needs complete Islamisation.

So,

Favour Pakistan, dear,
Come work for Pakistan.

In here is every treasure
Silver, gold, iron and copper,
Marble, cool, oil and things other
So much that no one can measure.

So,

Guard your Pakistan, dear.
Come, work for Pakistan.

By: Mr. Zahoor Ahmed Qureshi
Assistant: Prof: of English,
Govt: Degree College Latifabad Hyd.

Wordsworth and Nature

William Wordsworth, the greatest admire and worshipper of **Nature, was born at Cocker** mouth in Lake District, a beautiful region of Natural beauties in the North West of England. He passed a lot of his time in company of hills and rills, mountains and fountains, with the natural result that Nature entered his soul through the gates of his senses. In this respect, Ifer Evans has remarked, "From his childhood he had stored in his mind with the experiences in Nature, which later he was to recall in his verses." Perhaps no poet loved Nature more, appreciated her beauties better and interpreted her message more clearly than Wordsworth.

It is as a poet of Nature that he has exercised the profoundest influence on his contemporaries. About his Nature poetry, Jhon Macy says, "Wordsworth's poetry of Nature is so intimate and delicate that almost every subsequent writer about Nature in prose or verses, not excepting those who left the English country side for wild strange lands, has been a Wordsworthian." Wordsworth's poetry makes us realise the splendour of lakes and seas, the grandeur of fountains and mountains, the calmness of meadows and starry skies and the beauty of lilies and roses. To use the words of S. M. Bowra, "Wordsworth built his poetry on Nature. It was the source of his creative strength, and opened worlds of imagination to him. His poetry was inspired by the stirring of light and life, the building of flowers and the sunshine on the meadows".

To Wordsworth, Nature is not dead. It is a living forces. It is capable of thinking and feeling. Every object of Nature has a soul and when there is a mingling and inter - mingling, communion and inter - communion between the soul of Nature and that of Man, the result is perpetual happiness.

For oft on my couch I lie
In vacant or pensive mood
They flash upon that inward eye,
Which is the bliss of solitude,

And then my heart with pleasure fills
And dances with the daffodils.

There are two well-defined stages of Wordsworth's attitude towards Nature.

1. Attraction towards External Beauty of Nature.

As a boy, Wordsworth was attracted by the external beauty of Nature. The greeness of trees, the soft murmur of streams, the colour of flowers, the gentle noise of winds and the sound of cataracts- all, attracted his attention.

The sounding cataract.

Haunted me like a passion; the tall rock, The mountain, and the deep and gloomy wood, Their colours and their forms, were then to me an appetite.

This was the time when he took a sensous delight in all objects of Nature. He admired and apperciated them through his sense.

2. Realisation of Spiritual significance of Nature

With the passage of time, there came a change in Wordsworth's attitude towards Nature. The period of his "thoughless youth" soon ended and he realised that Nature was pervaded by a DIVINE SPIRIT and it was possible to hold communion with Nature. He began to appreciate spiritual significiance of all Natural objects such as meadows, groves, streams, flowers, hills, mountains etc. He feels that Nature has a message for man which can be understood, when one goes to her lap in a receptive mood. since Nature is the mirror of DIVINE REALITY it is through communion with Nature that man can realise his spiritual powers and establish contact with the Supreme Being.

Wordsworth loves calm and peaceful scenes of Nature. He does not take delight in the fierceful and horrible aspects of Nature, such as Thunder, lighting, floods, stroms etc. He always finds peace and comfort at the heart of Nature which has a soothing effect on human mind. The roses and lilies are to wordsworth the messangers of Nature. They ennoble and influence human mind and give it strength.

To me the meanest flower that blows can give
Thoughts that do often lie too deep for tears.

Wordsworth looks upon Nature as a great teacher and educator. It is a greater source of inspiration than schools, colleges and Universities. It is a safe guide to Truth and Wisdom. In this respect LOUIS CAZAMAIN has remarked, 'To Wordsworth, Nature appears as a formative influence superior to any other, the educative of senses and mind

and keeping the results in view, one sights no ray of hope emaniting from any quarter. Nevertheless, remedial measures are there bvt they can be taken on national level with the spirit and determintion that has never been wanting in the Muslims Ummah since the days of Hazrat Abu Bakr.

(a) A highly powerful commission on National Education be appointed to test, ascertain and evalute the attainment level, yearly performance and the academic tastes of each and every university and college teacher. Those foun lacking in academic capabilities and sholarship, must be relieved and accommodated elsewhere, filling in there posts by better qualified and abler youths, possessing teacher-temperament.

(b) A thorough Enquiry must be conducted to evalorate efficiency and integrity of the Secret Sections of the examining bodies. Thoee who can be purchased or influenced must be turned out and penalished sincerly. It is, in fact, absence of punishment that has encouraged every worng-deer to pursue his nefarious activities without any fear.

More ever, the Examination System must be modernised to suit the requirment of a developing nation. The examination must test the innate worth of a candidate, There should be no Grace Marks, no liberal conodonations, no modernation of the Award Lists Submitted by the examiners, and no sub-standard marking of the performance of the candidates. The result must paint the real picture of what the students and their teachers have been doing in the class-rooms during the session.

(c) In order to restore dignity to the teaching profession, to create among the teachers a sense of partnership and with a view to get prepared such education-schemes that can be possibly implemented by the working teachers, all Commissions must include a good number of reputed working teachers, not the courtiers and flatterers. Similarly various committees of the universties, Boards and Department of Edueation should have good representation of able and senior working teachers On the other hand, the top secret work, including setting of question-papers and their modernation, and assessment of Answer Books and its super vision be entrusted with working teachers of the subject concerned known for their integrity anp uprightness. The courtiers and flatterers should have no access to the Examination-work.

(d) The Admission Policy must be formulated in consultation with the teachers and enforced energetically without fear or favour. No consideration be shown to the influence or authority of the guardian to admit an undeserving student, and only as many students be admitted as a teacher may handle succcessfully. The others must go to the technical institutions where they may get instructions to suit their taste and aptitude- The politics loving youths must be directed to acquire education privately and should on no account be allowed to get mixed up with the Regular Students to spoil peace and tran

quility of their alma mater, and sanctity of Examinations.

More over, the Private candidates must not be allowed to take an examination direct. They must regularly submit their assignments to the approved teachers as is required by Allama Iqbal Open University, Islamabad.

(e) In order to rid our academic life of the undesireable, uncultured and rowdy and anti-social elements it is imperative that student's Unions be made to limit their activities to the academic pursuits and those student's organisations that are by-product of Political Parties must be banned and no student be allowed to acquire their membership.

(f) Attendance must be enforced strictly and sineerely and no student, whose attendence is short, be allowed to take the examination even if his father is a millionaire or a jagirdar of a minister. The colleges alone cannot successfuly implement attendance in the right earnest, although every educated person knows that without attendence, education is impossible. The University and the Board must share the responsibility by opening Attendence Sections which should every month call for attendence of all the students enrolled. Before the University or the Board sends the Examinations-Forms to the affiliated colleges, this Section must declare the names of these students who due to shartage of attendence, are inelligible to take the examination and are not, therefore, entitled to receive the Forms.

(g) The Government must enforce a unified Education Code throughout the country and all institutions be ordered to follow it in letters and spirit with all sincerty It must give full powers to the teachers to fine, expel and rusticate an unruly youth so that they may be able to enforce discipline inside or outside the class.

(8) The rules for selection of youths for various services and their promotions to higher jobs be so amended that merit gets precedence over all other considerations. Appointing poorly educated and ill-equipped youth on responsible jobs is a grave disservice to the nation and a very ugly method of spreading frustration among the talented youth.

Beside, the appointment of teachers must be subjected to psychological tests to discover if they possess teacher temperament, are loyal to the ideology of the country and possess the spirit of true Muslims.

But, the penetrating question is whether such measures can be adopted in a country where every thing is done with a political or personal bias. Can a democratic government take the risk of enforcing such reforms that would displease every self-seeker? No. Can Martial law serve the purpose? Certainly not at all. Only a courageous Government afraid of and accountable to Almighty Allah alone and devoted to the cause of truth, whatever the cost, can deliver the goods., and embark upon revolutionary programme In fact, we do not require an elected Parliament, nor a military junta to rid us of our ills. We require an Omar Bin Abdul Aziz to refer the society at all cost !

to four weeks. During this examination or just after, message arrives from the Board announcing the final date for filling in the Examination Forms. This provides the students with a golden opportunity to get rid of their classes because after the forms are gone, class-attendance has lost its significance. To our dismay, nobody equires whether holding of the Annual examination is justified in view of very insufficient number of lectures delivered and only a very small portion of the courses covered. Lectures or no lectures, attendence or no attendence, the examidations are held pudctually and the resuls place even the ill-equipped and very poorly educated youth in the first class. There are cases iwhen the students, who have never opened any of their course books; while there are others who, at the time of examination, do not remember the subjects they have filled in the examination forms. But mostly they are found comfortably placed amnog the successful canidates.

This sad state of affairs of the examination and their results have made the role of the teachers quite negligible and regular holding of the classes and calling the roll-call exerrises in futility. However, still there are teacher, juniors and seniors, who sticking to the old values and continue trying hard to burn the candle against all adverse winds, but they, too, are sad to see that the base of the edifice of education is on the verge of collapse.

Admissions:

During the good old days, as many studnets were admitted to the school or collges-classes as were allowed under the rules. But with the enforcement of universal compulsory Primary Education, the number of boys seeking admissin to High School classes grew tremendously. It became impossible for the school authorities strictly to follow the rules of admission. Consequently, the size of each class grow almost dobule. The teachers found it very difficult to accommodate about 100 students in a small class room that was meant for 30 to 40 boys. They could neither keep these students under control, nor could they correct their home-work. Thus, by and by effective teaching gave way. Both the teachers and the thaught started playing truant but they developed short-cut techniques to pass the Examination. The examining bodies were compelled to bring down their standard of evalution, declaring a large number of unfit youth successful at the S.S.C. Examination.

All of them rushed to colleges for admission, formed unions and employed political pressure on college-authorities to admit all of them even if there was no place for their standing in the class-room, or in the laboratories. Often thes included quite a good number of undesireable type of youth. They not only spoiled peace of the class rooms and broke all teaditions, but also captured Student's Unions to interfere in college

administration and conduct of examinations.

With the economic uplift of the country, job-opportunities increased. So the political parties felt short of workers. These students who found no cham in the lectur ies and no attraction in books, became workers and some times officbearers of the political parties. They brought political dissensions and influences to their institutions. Naturally, the education centres ceased to enjoy dignity and sanctity of the days gone by and lost their spiritual hold upon the so called 'seekers of knowledge' to such an extent that in time of emergency they had to seek police-aid to enforce discipline or conduct University Examinations.

With the advent of the police and the other law-enforcing agencies, the Professors and the scholars went into the back-ground. Even purely academic matters were decided out side academic atmosphere, some times by these who had nothing to do with education or learnings or the job of man-making. Thus, the admission of the unfit youth to the colleges, paved way for total cllapse of higher education.

The Gravest Tragedy:

The saddest aspect of our present day policies regarding admissions to technical and professional education, employment of highly educated and talented youth and their promotion to higher posts, is total disregard of merit. A system that ignores merits and lets other considerations get precedence over academic attainments and intellectual capabilities, can never successfully perform the job of man-making. Consequently, a very large number of capable and talented youth have been compelled to seek suitable jobs aboard or have taken to unacademic pursuits. Whereas our universities and other centres of learnings and Govt. Technical Departments are gavely short of highly qualified youth, our own sholars who can vie with the talented youth of any advanced country of the world grace the Lecture halls and high offices in the foreign lands, which are over ready to welcome telent and attract merit from other nations.

This alarming loss that this brain-drain is causing to out academic and intellectual life, is felt by every body in authority, but we have yet to wait for practicalond sincere steps that may to attract our lost talent back home.

The Remedial Measures:

Our affairs in education and other allied fields have grown so worse that every citizen, who is endowed with a little power to think, asks in wonder, if there can be any remedy to the ills that have best our educational system and have eaten away all our academic values. Looking to the efforts of various Commissions on National Education

their places of duty on foot, were not only regular, punctual and thoroughly honest in the performance of their duties both curricular and extra-curricular, but also passed their spare periods in libraries and spent their evenings with their students in creating sportsman spirit and encouraging team work. There were no strikes no class-Boycotts and no student-movement. The teachers and the taught were hand and glove in fighting the spectre of ignorance banishing inefficiency and carving out their way to greateness and glory.

The Era of EducatiOnal Reforms;

Soon set in the area of Educational Reforms. Politics entered colleges and universities to create the student-movements that terribly shook the foundation of the old syetem and tolled the knell of the basic academic values The rules of discipline were ignored, the education codes were dumped into cold storage and subsequently totally forgotten and the moral traditions were all broken. With the result that the class-rooms were deserted, teaching suffered a serious set back and learning became out of fashion. Gone were the days of calm and quiet atmosphere of academic centres. Now they presented scenes of bloody battles. The students found themselves pitched against their own teachers. The university-offices were locked the teachers beaten and the fellow students shot. The youth fashioned and moulded in such institutions could win no laurels neither on the civil scene, nor on the military front. From every field of life came agonising complaints of inefficiency, dishonesty and treacherous disregard of duty. On the other hand the readers of newspapers, to their dismay found the university students leading the dacoits, committing heart-rending murders and similar heinous and ghastly crimes. Certainly the educational institutions have ceased producing scholars, writers, scientists and philosophers. Instead they have become breeding grounds of lawbreakers, anti-social and anti-national elements.

The Main Problem:

What have, then our educational institutions been doing? They open regularly The teachers are sufficiently qualified and well-paid. They come to the places of their duty mostly on motor-cycles and live in decent houses. The students, too, possess motor-bikes, put on fancy dresses and enjoy most to the comforts of modern life. On the other hand, the Govt. budget for edueation is swelling every year. Several Education Commissions have met to review the performance of the Reforms and have taken further steps for improvement. Why have all these steps involving expenditure of crores of Rupees out of Public Exchequer, failed to give our youth the right type of education? The answer is quite simple. "Compromise on every academic value."

The Fate of Attendence:

Regularity and punctuality is a must in the task of education. Although Attendance Registers are maintained; Roll-call is regularly taken, but attendance has partically no place in the scheme of our examinations. The neglect of class-attendance has grown to such dimensions that no institution possesses enough courage to enforce it in right earnest aud with hold 80% of the examination forms for fear of repurcussions, animosity of the students and hue and cry of the local leaders and the press.

Misuse of Syllabi of CourseS & Examinations:

Next come the syllabi of courses which are prepared without taking the teachers concerned into confidence by highly qualified and well-placed officials most of whom have no touch with the students for whom their schemes are meant. Although the students level of attainment is decreasing every year, and due to various causes the number of lectures delivered in the class is going down fast. but the syllabi are every now and then growing in size in order to vie with the advanced countries of the world. But as bad luck has it, the colleges and the universites do not remain opened for lectures for the specified time and the group of students attending the class is often varying, it is well nigh impossible to complete even a sizeable part of the prescribed course. On the other hand, the students find their course beyond the level of their comprehension, but they are determined to get through the examination by fair or foul means. Due to inefficiency of Secret Sections of the examining bodies and their (students) own efficient "Foreign Aid serurce'', they manage to procure copies of question papers in advance, get written Answer Books smuggled into the examination-hall and, if the poor invigilator tries to intervene he can be silenced with the help of a first or a club or a knife or a revolver or simply by threat of physical assault. One can better imagine the fate of meritorious hard working and up right type of examinees.

The role of Teachers:

It must be borne in mind that the teachers, whatever their complexion or idiology are a part and parcel of the nation, particularly the new entrants to the profession are naturaly the product of their own age. They can, therefore, never be considered exempted from the weaknesses prevalent amoung the youth of their time. But can they under the present circumstances, really play their part to the satisfaction of their conscience? The colleges are supposed to work say for 200 days, if there is no national trouble or natural calamity. After the admissions are over the classes start in time. When a small portion is covered, summons reach from the Board that the supplementary examination is to start on such an and such a date. The classes are, therefore, suspended for about four weeks. The administrators and the teachers again do their best to assemble the lost sheep. They hardly go a few steps further, when call from the Universiy comes that the Annual Examieation is to start soon. So the classes are again disturbed for another three

teaching techniques. Each subject needs a thorough planning of lessons in manageable units with audio visual aids, and the teachers be initiated into a crash refresher course. Such courses shonld include enough practice lessons to be given by the teacher under-orientation. later he may act as master trainer in his subject in his institution. All subjects need be taught at College level according to modern methods

As for the students the new entrants in particular, they too badly need some kind of a crash-initiation course. One of the drawbacks of College education, British style, as introduced in the sub-continent was the absence of tutorial system and lack of seminars which are vital to the British system Lecturing, minus tutorials and seminars leads students nowhere No wonder they grope about in the twilight all the while. The first step in this direction could be an intensive rapid review course in spoken and written English.

It should cover the fundamentals of the four-skills, namely reading, writing, listening and speaking. A four mouth course under enthusiastic teachers would create confidence in self expression. It might also sound a death knell to private tutoring so rampant these days that colleges have become hunting grounds for the greedy and the unconscientions. This proposed course should specifically concentrate on functional and scientific English. Confidence in self expression coupled with seminars and tutorial system might go a long way in improving the situtation available all around at the moment.

Introduction of monthly, quarterly and half-yearly examinations is necessary for educational improvement. Maintenance of student records (known as progress reports) will motivate the students to address themselves seriously to the task of learning. Periodic tests should be compulsory and a prerequisite for final clearance for the Board and University Examinations.

As the objective of education is the development of the total personality of the student, I attach equal importance to the co-curricular and extra-curricular activities. Need I repeat the cliche that the student of today is the citizen of tomorrow, all the more so in a democratic society. He needs ample opportunities to groom himself as the leader of the future. Pair work group discussions, seminars tutorials, group projects are some of the activities that will enhance their acquisition of knowledge.

Debates, clocutions, deelamations and quiz contests will provide further exercise in public communication and produce qualities of leadership.

Before I conclude, let me take up a probable objection. To some, I may appear too idealistic in my approach. I only wish to ask Aren't such things going on else where in the world? If so, why not in Pakistan.

Please remember, we are not a backward country any more We are about to join the nuclear Club, if we opt for it Should our colleges then always be producers of mediocrity? Consult your conscience for a candid response.

Our Deteriorating Standards

Prof: Anwar Ahmed

"Our education base remained sound", replied the Japanese educationist to the question how it is that Japan. In spite of two atomic blasts on its important industrial centres and the ultimate defeat in World War II, Could emerge as one of the leading countries of the world in industrial field, particularly in the manufacture of Electronics.

We, too, in spite of a hard, tough and bloody struggle, the on slaught that followed the announcement of The Partition Plan, and the blood bath through which about ten million muslims had to wade their way to the soil of their dreamland, could emerge as a young and promising fifth largest country of the world, but also could successfully frustrate the evil designs of the largest democracy of the world i.e Bharat, in 1965 War. That was possible because the generation that had succeeded in creating a home-land for a divided group of muslims of India, was sound both merally and educationaly. But the following generation that was manning the affairs of the country in the civil and millitary fields, were lacking in the qualities that their predecessors had in abundance. That was why that the country had not only to suffer a humiliating defeat in 1971, but also lost the eastern wing.

This contrast between the performances of the two generations provided us with food for thought.

The Post Partition Institutions:

The institutions that fell to our lot after the Partition were quite improvised ill-equipped and lacking in basic facilities but the students that field them, though sons and daughters of ignorant, ill-fad and ill-clad people, were determined to equip themselves with knowledge, and the teachers, though low paid and very poorly provided but full of Pakistani spirit, were resolved to turn the pupils under their care into capable youths, of a vigorously rising nation. On the other hand, the youths, who from far and wide flocked to the colleges and the universities, attended their classes with great zeal, did their homework with all sincerity and obeyed their teachers commands with humility and their professors, who received small salaries lived in undignified houses and walked to

Prof. Muhammad Nasir Raza Khan
Principal
Govt. College, Hyderabad.

Message

I am immensely delighted to know that the staff and the students of Government College. Latifabad, are bringing out the College Magazine to high light their academic and sports activities.

While Principal of that College I did my best to prepare ground for bringing out a literary journal and the preliminary preparations were taken in hand: I am glad that the present Principal, Prof. Zakir Hussain Qureshi, has perued the task and is taking keen interest in the curricular and co-curricular activities of his students.

A Literary journal mirrors the real picture of a College and lets the public in general and the parents in particular know what the staff and the students are doing to earn name and fame for their institution.

I hope that the students of the College would pay more attention to the academic and allied activities, shun politics and keep away from unfair activities that are a blot on the fair image of the students community and the teachers on their part would do their best to inculcate among their students love for Pakistan idiology and zeal for the islamic values so that we may be able to earn a name in the commity of the Nations.

In the end, I congratulate the Principal, the members of the teaching staff and the students for their efforts in bringing out a literary journal in these hard times.

I wish all bright success.

(Mohabammad Nasir Raza Khan)
Principal,
Government College, Hyderabad....

What is Wrong With College Education

Prof: Muhammad Nasir Raza Khan

The observation I make here involve three decades of my teaching and administrative experience I presenr them as food for thought to the teaching community in particular, and the educationists in general.

What is woring with our educational system? The answer is far from being simple. Reducing the area of inquiry I wish to confine it to the Secondary and College levels, for that serves our immediate objective.

There seems to be an unbridegeable gap of standard between the Secondary and the College education For Class XI student it is not an easy switch-over. He feels at odds at every step in his academic pursuits. Things appeared easy to him at school whereas at College he feels to have reached the dead end of the alley. He, therefore, labours under a backlash from the school days.

On the idealistic level it could be claimed that streamlining the Secondary education would solve the problem automatically and to our heart's content We would get the stuff of the required quality and thence forward it ought to be smooth sailing for ever one concerned, that is, the teacher as well as the taught But reality is alwnys variant with ideality for the obvious reason that it is neither so simple nor so direct to manipulate at ease.

The Secondary educationists have their own cheerless story to narrate. Over-crowding disparity between teacher-taught ratio, multiplicity of the media of instructions chronic shortage of competent teachers, absence of individiual attention, lack of epuipment, indifference to latest teaching methodology, are some of their grievances.

They claim a feather for their caps for working against such insurmountable odds. The present writer is not in a position to evaluate the validity or otherwise of the secondary level educator's grievances. Prima facie there seems to be no reason to doubt the genuineness of their complaints.

The net result from the college teacher's view-point is this: he is confronted with a mixed lot. Barring a negligible minority which hails from reputed and well established institutions the college teacher is faeed with a large body of mediocre and below-average students.

How should he go about? what can be done to bridge the gap and set the freshmen on the right track? Here are a few tentative suggestions for the consideration of interested

There is a desparate need to establish a bureaue of curriculum of colleges. Refresher courses need be devised for teachers so that routine lecturing is substituted for modern

Phone : 30252

DIRECTOR OF COLLEGE EDUCATION
HYDERABAD REGION,
HYDERABAD

Dated ~~9th August,~~ 1986.

MESSAGE.

I am delighted to know about the publication of the latest issue of your College Magazine. The importance of such creative activities, which go a long way in boosting up academic standards can hardly be over-emphasized. I would be happy if sincere efforts are made to make it a regular feature.

For quite some times, there has been a marked deterioration in the standard of education. All possible efforts have to be made at all levels to put the education on the right track. Without meaningful and qualitative education a nation cannot make rapid progress. In Pakistan development of education has been assigned national priority. It is the duty of every patrioratic citizen to make use of the existing facilities and contribute their valuable share in the future development of education to bring it at par with the international standards.

Aahan
9/8/86

(PROF: AFTAB AHMED KHAN)
DIRECTOR OF COLLEGE EDUCATION,
HYDERABAD REGION, HYDERABAD(S).

Prof: AFTAB AHMED KHAN

Director College Education Hyderabad Region, Hyderabad.

Editorial Board

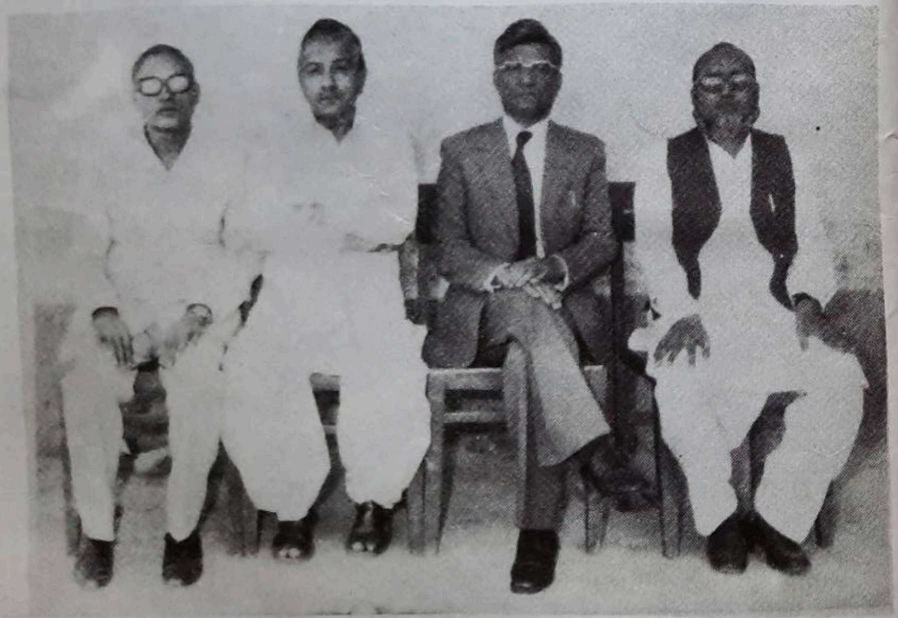

Principal with Professors-in-Charge, Debating Societies.

OUR COLLEGE

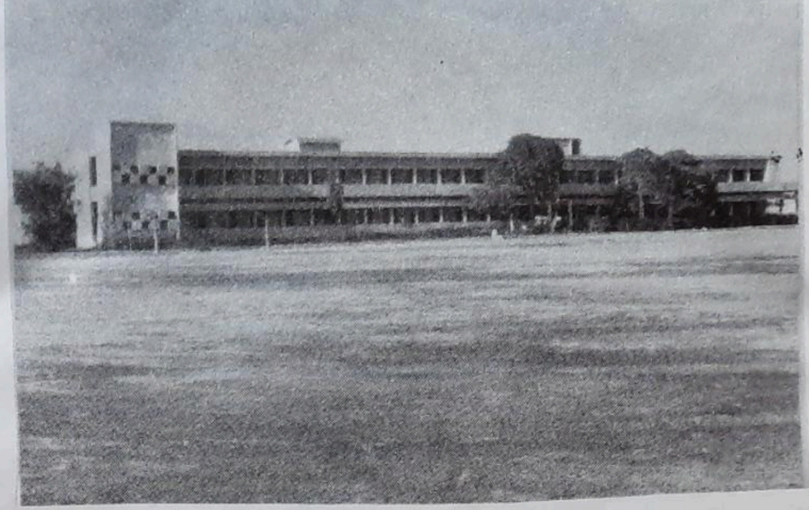

FRONT VIEW

REAR VIEW

Editor - in - Chief

Prof: Miskeen Ahmed Mansoor

Teaching Staff

which I have received from our worthy Principal, Professor Mohammad Zakir Hussain Qureshi in bringing out the **MASHAL**, I also remember with gratitude the efforts made by our former Principal, Professor **Nasir Raza** Khan who is the initiator of many a reformative steps in this college.

MASHAL is a symbol of light, love and hope. It spreads the light of knowledge, inculcates love for learning and creates new hopes for future.

In the end I take this opportunity to record our heart-felt felicitation to our worthy Director of College Education, Professor **Aftab Ahmed Khan** who has a very long and meritorious record of sincer service in the cause of education. We pray for his success in the onerous task that lies before him and pray to God for his bright seccess in every field. We on our part, assure him of our full and sincere co-operation.

MISKEEN AHMED MANSOR
Editor - in - Chief

PRINCIPAL

Prof: Zakir Husain Qureshi

8700

CONTENTS

1.	Edetorial	Editor - in - Chief
2.	What is wrong with College Education	Prof. Mohammad Nasir Raza Khan
3.	Our Deteriorating Standards	Prof. Anwar Ahmed
4.	Wordsworth and Nature	Prof. Zahoor Ahmed Qureshi
5.	A Great Teacher Greater Mon	Prof. Miskeen Ahmed Mansoor
6.	Eminent Contributors to Zoology	Prof. Din Mohammad Shaikh

Editorial

READ IN THE NAME OF YOUR LORD WHO CREATED.

This is the third issue of our college magazine, "**MASHAL**"; and we feel curious joy in bringing it out.

Ignorance is a sin and knowledge is a blessing. So human journey continues from darkness to light; from ignorance to knowledge. College magazines are reflection of their institions. They reflect the ideals and aspirations of learned and the learners. They create love for knowledge, aspiration for wisdom and sense of justice which is the basic purpose of education. They bring out the hidden qualities of our students. In these pages we can find, at a glance, some of the future leaders of our country.

The main purpose of the MASHAL is to encourage our students to discover their own imaginative and creative powers. It provides them with an apportunity to express their ideas in their own words and experience delicate delights of self-expression. I strongly believe that with their fresh and fertile minds they can imagine and look at the new expanses of the universe and its inhabitants. The streams of their imagination are full of fresh and clean ideas which are symbols of life and its reproduction. It is obivious from their imaginative and creative activities that whatever they want to say it clearly, plainly and honestly. I congratulate them for their sencere efforts to illuminate the MASHAL with their creative reflections.

I am greatly thankful to the worthy and learned professor of our college for their valuable contributions, It is an honour for me to acknowledge the kind help and guidance

8700
ACCESSION NO:
G.D.C & P.G Center LIBRARY
Ref

With Best Compliments from

PRINCIPAL, STAFF & STUDENTS

GOVT. DEGREE COLLEGE, LATIFABAD. HYD.

respect of ....

Editor Urdu Section
Prof: Saiyed Abid Husain

Editor Sindhi Section
Prof: Hasan Ali Bughio

1985 - 1986

Government Degree College

Latifabad, Hyderabad. (Pakistan)

814